ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

نومبر ۲۰۲۲ء

محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اترپردیش

۱۵ روپے

وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ اعلیٰ فوجی افسران کے ساتھ آرمی کے جوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے۔

وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ فوج کے اعلیٰ افسران کی موجودگی میں خاتون کو اعزاز سے نوازتے ہوئے ساتھ میں
پرنسپل سکریٹری جناب سنجے پرساد اور چیف سکریٹری جناب درگا شنکر مشرا بھی موجود تھے۔

جلد:77 شمارہ:07

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

نومبر ۲۰۲۲ء

سرپرست
جناب سنجے پرساد
پرنسپل سکریٹری محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اترپردیش

پبلشر: ششر (ڈائرکٹر، انفارمیشن)

جناب انشمان ترپاٹھی (ایڈیشنل ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ادارتی مشیر
محترمہ کُمکُم شرما (ڈپٹی ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ایڈیٹر
ریحان عباس
رابطہ:9838931772
Email:nayadaurmonthly@gmail.com

معاون: شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ:
صباعرفی:7705800953
آسیہ خاتون

تزئین کار: ایم۔ ایچ۔ ندوی
مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ
شائع کردہ: محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اترپردیش
زرِ سالانہ: ۱۸۰ روپے
ترسیل زر کا پتہ
ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پنڈت دین دیال اُپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ،
اترپردیش، لکھنؤ226001

Pleas send Cheque/Bank Draft in favour of Director,Information & Public Relations Department,Pandit Deendayal Upadhyay Soochna Parisar,UP,Lucknow

خط وکتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱
بذریعہ کوریئر/رجسٹرڈ پوسٹ
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، سوچنا بھون، اترپردیش لکھنؤ226001

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

اس شمارے میں...

اداریہ

اپنی بات		۲

مضامین

ہندوستانی رنگوں میں ڈوبا ہوا مصورالفاظ: عمیق حنفی	ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی	۳
منور رانا: ماں سے مہاجر نامہ تک	پروفیسر عباس رضا نیر	۵
قاضی عبدالغفار اور ان کا سفرنامہ "نقش فرنگ"	ڈاکٹر فیضان حیدر	۹
اردو کے عظیم سفیر و محسن: پروفیسر گوپی چند نارنگ	ڈاکٹر راشد میاں	۱۳
خطوطِ غالب کا فنی وفکری کینوس	منظور احمد گنائی	۱۶

منظومات

غزل	شریف قریشی	۱۹
غزلیں	رؤف خیر/اسلم محمود	۲۰
غزلیں	ڈاکٹر شیدا اعظمی/محمد الیاس	۲۱
غزل	ہنر رسولپوری	۲۸
غزل	مظہر زاہدی	۳۰

افسانے

قسمت	رانا	۲۲
احساس	ترنم زیدی	۲۵
ایک لمحہ	عدنان	۲۹

افسانچے

استاد	ذکری حمید علیگ	۳۱

ترقیات

خواتین کا تحفظ حکومت کی اولین ترجیح	سید نازش احمد	۳۲

ماہنامہ نیا دور، information.up.nic.in ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔
قیمت فی شمارہ: پندرہ روپے   سالانہ رکنیت فیس: ایک سو اسی روپے
دو سال کی رکنیت فیس: تین سو ساٹھ روپے
تین سال کی رکنیت فیس: پانچ سو چالیس روپے

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام ترمشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اترپردیش کا متفق ہونا بہرحال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

”ماہنامہ نیادور“ نومبر ۲۰۲۲ء کا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔

”ماہنامہ نیادور“ کے باوقار تخلیق کاروں اور قلمکاروں کے قلمی و تخلیقی تعاون اور اس جریدے کے باذوق قارئین و شائقین کی حوصلہ افزائیوں سے ماہنامہ نیادور کی اشاعت کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ بہت ہی کم وقت میں تاخیر شدہ شماروں کی طباعت کا کام کافی حد تک مکمل کیا جاچکا ہے، چونکہ اس رسالے کی اشاعت کا دورانیہ ڈھائی سال کے عرصہ سے بھی زیادہ تھا۔ سرکاری رسالہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک بہت سی پیچیدگیاں ضرور حائل ہیں، جس کا تدارک کرنے کی مسلسل کوشش کی جارہی ہے۔ ابھی ایک اہم مسئلہ ضرور درپیش ہے، اس لئے کہ رسالہ شائع ضرور ہورہا ہے لیکن لوگوں تک ابھی پہنچ نہیں رہا ہے۔ میگزین کے ڈسپیچ میں کچھ مسائل درپیش تھے جس کی وجہ سے رسالہ آپ لوگوں تک نہیں پہنچ پایا لیکن اب ڈسپیچ کا معاملہ میگزین کے سرپرستان کی وجہ سے حل ہوگیا ہے۔ بہت جلد یہ تمام شائع شدہ شمارہ آپ سبھی حضرات کو ارسال کیے جائیں گے۔ اس تاخیر کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے۔

ماہنامہ نیادور سے وابستہ ایک اہم تخلیق کار جو حساس ذہنوں کے بامقصد ترجمان، ہجرت کے کرب کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے والے اردو غزل کو نئی جہت اور سمت دینے والے، زلف و رخسار، جام و مینا، گل و بلبل کے پیرائے سے نکل کر ماں کے تقدس سے وابستہ کرنے والے اردو ادب کے مشہور شاعر منور رانا نے جو ڈائیلاسس پر اپنی زندگی گزار رہے تھے، ۱۴ رجنوری ۲۰۲۴ بروز اتوار بوقت ساڑھے گیارہ بجے شب میں اس فانی دنیا کو الوداع کہا۔ اس طرح ہمارے درمیان سے ایک بڑی شخصیت چلی گئی جسے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کرسکتا، اسی لیے اس شمارہ میں خاص کر پروفیسر عباس رضا نیر کا ایک مضمون ”منور رانا: ماں سے مہاجر نامہ تک“ شامل کیا جارہا ہے، جس سے قارئین کو مرحوم منور رانا کی ماں سے انسیت اور اُن کے وقار کا علم ہوسکے۔ ماں کے تئیں اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے عقیدت سے لبریز ماں کے لیے اشعار کہے، چند شعر یہاں پیش کئے جارہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

یہ ایسا قرض ہے جو میں ادا کر ہی نہیں سکتا
میں جب تک گھر نہ لوٹوں میری ماں سجدے میں رہتی ہے

☆

لبوں پہ اس کے کبھی بددعا نہیں ہوتی
بس ایک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

منور رانا ایک ایسی شخصیت تھے جنہوں نے ماں کی محبت کو اپنے اشعار میں ڈھال کر ایک منفرد اور انوکھے شاعر کا رتبہ پایا، ماں کا پیار، ماں کی ممتا، ماں کا تصور اور ماں کی دعائیں، ماں کی قربانیاں، ماں کے ایثار و خلوص کو انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ عوام کو واقف کرایا۔ ماں کے علاوہ انہوں نے ”مہاجر نامہ“ میں تقسیم ہند کے حادثے سے متاثر ہوکر ان مجبور اور بے کس انسانوں کی داستان کو پیش کیا ہے جنہوں نے ہجرت کا کرب سہا ہے، پانچ سو اشعار پر مشتمل اس طویل غزل کا ہر شعر اپنے آپ میں ایک مکمل داستان ہے۔

مذکورہ شمارے میں سابق ایڈیٹر نیادور جناب ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کا مضمون ”ہندوستانی رنگوں میں ڈوبا ہوا مصور الفاظ: عمیق حنفی“ ڈاکٹر فیضان حیدر کا مضمون قاضی عبدالغفار اور ان کا سفرنامہ ”نقش فرنگ“ ڈاکٹر راشد میاں کا ”اردو کے عظیم سفیر و محسن: پروفیسر گوپی چند نارنگ“ اور منظور احمد گنائی کا ”خطوطِ غالب کا فنی و فکری کینوس“ شامل کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ قارئین ضرور پسند فرمائیں گے۔

ریحان عباس

یہ شمارہ نومبر ۲۰۲۲ء کا ہے جس کو فروری ۲۰۲۴ء میں شائع کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

سابق ایڈیٹر: نیا دور، 366/06/413 گولڈن سٹی کیمبل روڈ، کشور گنج لکھنو ۳

9889051003

ہندوستانی رنگوں میں ڈوبا ہوا مصور الفاظ: عمیق حنفی

بعض شخصیات عمیق حیات کی حامل ہوتی ہیں جنہیں مجسم اور مجرد احساسی کہنا چاہیئے۔ غور و خوض اور تفکر و تدبر کے عامل، ان کی شخصیت کا حصہ ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر فرد کا بغور مطالعہ و مشاہدہ اور تجربہ کرتی ہیں۔ اس لیے ان کا مطالعاتی اور تجزیاتی انداز، جزیاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ جس سے کلی استخراج بخوبی حاصل کیے جاسکتے ہیں ایسی ہی ایک شخصیت کا نام ہے ''عمیق حنفی'' ان کا اصل نام محمد العزیز حنفی تھا۔ عمیق حنفی کی ولادت 3/نومبر 1939 کو ان کے نانہال مہو، مدھیہ پردیش میں ہوئی۔ مہو اردو زبان و ادب کا ایک زرخیز خطہ رہا ہے۔ اس سرزمین سے بڑی بڑی ہستیوں نے جنم لیا۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی جائے ولادت مہو ہے۔ اسی وجہ سے مہو کا نام تبدیل کر کے ڈاکٹر امبیڈکر نگر کر دیا۔ عمیق حنفی کی تعلیم و تربیت اور تخلیقی سفر کی شروعات یہیں سے ہوئی۔ ان کے والد ماجد کا نام عبد البصیر تھا، ماموں محمد یعقوب ایک مشہور و معروف وکیل تھے۔ عمیق حنفی کو اردو فارسی اور انگریزی زبانوں سے بڑا اشغف تھا۔ انہوں نے ہندی، سنسکرت زبانوں کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔

ان کے والد عبد البصیر دیور اس میں ملازمت کرتے تھے۔ عبد البصیر پڑوسی مایہ ناز موسیقی کار استاد رجب علی خاں تھے۔ جن سے ان کے گھریلو مراسم ہو چکے تھے۔ جب بھی عمیق حنفی اپنے والد صاحب کے پاس جاتے تو ان کا بیشتر وقت استاد رجب علی خاں کے ہی گھر میں گزرتا۔ ابھی کمسنی ہی تھی لیکن وہ موسیقی کی ریاضت اور رباب و ساز کے ماحول سے بہت زیادہ متاثر ہونے لگے۔ ان کے ذہن میں ایک موسیقار بننے کا خیال گھر کرنے لگا۔ موسیقی سے زیادہ رغبت دیکھنے کی وجہ سے ان کے والد سخت ناراض ہوئے اور انہیں اپنی تعلیم کی طرف دھیان دینے کی تنبیہ دی جس کی وجہ سے یہ خیال ترک کر کے اپنی تعلیم اور شعر و شاعری کی طرف راغب ہو گئے۔

بچپن سے ہی ان کے اندر ایک تخلیق کار نے جنم لے لیا تھا جس کی نشو نما شروع ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آٹھویں کلاس سے ہی وہ اپنے خیالات کو قلم بند کرنے لگے تھے۔ انٹرمیڈیٹ تک پہنچتے پہنچتے وہ ہندی میں شعر موزوں کرنے لگے۔ کالج میگزین میں ان کی کویتائیں شائع ہوئیں۔ پھر اخبارات و رسائل میں ان کی تخلیقات کو مناسب جگہ ملنے لگی۔ یہ سچ ہے کہ کسی بھی تخلیق کار کی تخلیقات شائع ہونے کے بعد اس کے عزم و حوصلہ میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ گریجویشن کے بعد انھوں نے تاریخ اور سیاست میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد مہو کے ہی ایک اسکول میں بحیثیت استاد درس و تدریس دینے لگے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''سانسوں کے گیت'' موضوع سے ہندی دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوا چونکہ انہیں اردو زبان و ادب سے بڑی انسیت تھی اس لیے ان کا یہ تخلیقی جذبہ خوب سے خوب تر ہونے لگا۔ انہوں نے علم و ادب و تحقیق، تنقید، تحریر و تقریر، مطالعہ و مشاہدہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ شاعری کے ساتھ ہی انھیں فن موسیقی فن مصوری اور ڈراما نگاری سے کافی دلچسپی تھی۔ علاوہ ازیں، تاریخ، فلسفہ اور جمالیات پر بھی عمیق حنفی کا عمیق مطالعہ تھا۔ وہ درس و تدریس کے امور تو نبھا ہی رہے تھے لیکن زندگی کو اپنے مزاج اپنی خواہشات کے ساتھ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ایک ایسے پلیٹ فارم کی تلاش میں تھے جو ان کے ذہن و قلب کو سکون بخشے اور لکھنے پڑھنے والوں کی بزم بھی فراہم ہو سکے۔

ان کے مزاج اور خواہشات کے مطابق انہیں آل انڈیا ریڈیو بھوپال میں بطور اسکرپٹ رائیٹر ملازمت مل گئی پھر تو ان کی تخلیقی قوت کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ انہوں نے اردو ریڈیائی ڈراموں کو ایک نئی جہت دی، چونکہ وہ خود ایک ڈرامہ نگار تھے۔ ریڈیو اسٹیشن سے ان کے پیش کردہ ڈراموں نے دھوم مچا دی۔ آہستہ آہستہ اپنی علمی لیاقت ذہنی بصیرت اور اپنی تخلیقی ہنر مندی کے سبب وہ پروگرام ایگزیکیٹیو کے عہدے پر فائز ہوئے۔ آل انڈیا ریڈیو امیکا پور اور لکھنؤ میں بطور اسٹیشن ڈائرکٹر اپنی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ 1984 میں اسٹاف ٹریننگ کے ڈائرکٹر بنائے گئے۔ 30/نومبر 1987ء کو وہ ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔ عمیق حنفی کی خدمات کو دیکھتے ہوئے ان کی تخلیقات کا بھی مختصر جائزہ لینا ضروری ہے۔ اردو زبان و ادب میں عمیق حنفی کی شعر گوئی کی شروعات 1952 میں ہوئی۔ اپنی ذہنی و فکری نیز فنکارانہ صلاحیت کے سبب ان کی شاعری کافی مقبول ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شعری مجموعہ ''سنگ پیرہن'' 1958 میں شائع ہو گیا۔

''اپنی شاعری سے متعلق یہ بات کوئی بڑا شاعر ہی تحریر کر سکتا ہے۔ ان کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت ان کے نظریات صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا دوسرا مجموعہ کلام ''کلام شب گشت'' 1969 میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں بھی انکی نظمیں اور کچھ غزلیں شامل ہیں۔ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ ''سند باد'' 1966 میں شائع ہوا۔ ''سنجر صدا'' ان کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جو 1975 میں شائع ہوا۔ بحیثیت نظم گو عمیق حنفی کا ایک بڑا مقام ہے۔ صلصلہ الجرس ان کی مشہور و معروف نظم ہے جس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس طویل نظم میں عمیق حنفی نے رسول خداؐ کی سیرت کو موضوع بنایا ہے۔ یہ نظم 1971 میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی۔

عمیق حنفی نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے ریڈیائی ڈرامے کو ایک نئی جہت دی۔ اردو ڈرامے کے ارتقاء میں ان کی خدمات کو سراہا بھی گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ آئینہ کا کورس 1979 میں منظر عام پر آیا۔''

اس مجموعے میں شامل نظمیں، غزلیں، قطعات، رباعیات سے ان کی شاعری کی سمت و رفتار اور رجحانات کا بخوبی کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اپنی شاعری سے متعلق خود ہی اس مجموعے میں اپنی بات کے تحت لکھتے ہیں:

"مجھے اپنے اور اپنی شاعری کے بارے میں نہ کوئی خوش فہمی ہے نہ غلط فہمی، نہ دعویٰ ہے نہ شرمندگی۔ میری شاعری میں آپ کو ہندوستان بالخصوص مالوے کی فضا ملے گی۔ بعض ایسے الفاظ، تشبیہات و تلمیحات ملیں گے جنہیں ہندی یا ہندوی کہا جاسکتا ہے میں اپنی شاعری کی آفاقیت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اپنے دیش کی آب و گل سے رنگ و روغن حاصل کر کے اس کی اجنبیت ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے کلام میں آپ کو کہیں کلاسکی اور کہیں رومانی کہیں انقلابی کہیں تجرباتی عناصر نظر آئیں گے لیکن ایک اور بات نظر آئے گی کہ میرا ذہنی مسلک ترقی پسندانہ ہے۔"

اپنی شاعری سے متعلق یہ بات کوئی بڑا شاعر ہی تحریر کرسکتا ہے۔ ان کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت ان کے نظریات صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا دوسرا مجموعہ کلام" کلام شب گشت" 1969 میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں بھی انکی نظمیں اور کچھ غزلیں شامل ہیں۔ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ" سند باد" 1966 میں شائع ہوا۔ "سنجر صدا" ان کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جو 1975 میں شائع ہوا۔ بحیثیت نظم گو عمیق حنفی کا ایک بڑا مقام ہے۔ صلصلہ الجرس ان کی مشہور و معروف نظم ہے جس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس طویل نظم میں عمیق حنفی نے رسول خداؑ کی سیرت کو موضوع بنایا ہے۔ یہ نظم 1971 میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی۔

نظموں میں انہیں دسترس حاصل تھی۔ ان کی چند نظموں کے بند ملاحظہ ہوں۔

یہ ہانڈی ابلنے لگی
یہ مٹی کی ہانڈی ابلنے لگی
یہ مٹی کی دیوانی ہانڈی ابلنے لگی
دم نخود ہے
وہ جس کی ضیافت کی تیاریاں تھیں، کہاں ہے
میری آتما جاگ کر چیختی ہے
یہ ہانڈی ابلنے لگی

یہ بند تھے ان کی نظم کے "امال" سے۔ اب "سند باد" نظم کی کچھ لائنیں پیش ہیں: ملاحظہ کیجئے:

بندرگاہ کی چوکی پر
سند باد جب زمین جہاں کے سفر پر نکلا
اس کے ساتھ میں کوئی نہیں تھا
ہاں، لیکن اس کا ہم زاد
اک شاعر کا کرب المیاتی احساس
گھائل روح کی یہ آواز
اور خیالوں کے آزاد تلازم کی رو
دیکھیں آپ کے ذہن و دل میں کتنی دور پہنچ پاتی ہے
اور وہاں سے لوٹ کر مجھ پر
پھول کہ پتھر برساتی ہے۔

انکی مشہور و مقبول نظموں میں سند باد، شہزاد، سیارگاں، شب گشت، کیو پیڈ یا، صورت ناقوس، ویت نام، سبز آگ اور صلصلۃ الجرس وغیرہ ہیں۔

جہاں تک انکی غزلوں کی بات ہے اس میں بھی انھوں نے اپنے عہد کے لحاظ سے غزل کی روایت کو برتا ہے پہلے مجموعے کی غزلیں کلاسیکی انداز کی ہیں لیکن بعد کی غزلوں پر ان کا ترقی پسندانہ رجحان غالب ہے۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

وہ تو الجھے رہتے ہیں گیسوئے پریشان میں
زندگی کی گتھی کو ہائے کون سلجھائے

☆☆☆

خون دل ہے شعروں میں بولتی ہیں تصویریں
سمجھ رہی ہیں تقدیریں مل اٹھی ہیں تدبیریں

☆☆☆

آپ تو نہیں آتے صرف یاد آتے ہیں
رات بھر تصور میں شعر گنگناتے ہیں

☆☆☆

گلہ دھنک شفق بادل شاعری و موسیقی
رنگ جس قدر بھی ہیں مجھ سے میل کھاتے ہیں

☆☆☆

یہ سمجھے جن کی رگوں میں ہے مرے لمس کی آنچ
کبھی کبھی تمہیں آکر بہت ستائیں گے

☆☆☆

تیرتا ہے ذہن یوں جیسے فضا میں کچھ نہیں
اور دل سینے میں ہے اک ماہی بے آب سا

☆☆☆

عشق کے ہجے بھی جو نہ جانیں وہ ہیں عشق کے دعویدار
جیسے عمر میں رٹ کر گاتے ہیں بچے اسکول میں

عمیق حنفی نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے ریڈیائی ڈرامے کو ایک نئی جہت دی۔ اردو ڈرامے کے ارتقا میں ان کی خدمات کو سراہا بھی گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ آئینہ کا کورس 1979 میں منظر عام پر آیا۔

ان کے تنقیدی مضامین نے اردو تنقید کو ایک نیا موڑ دیا۔ تنقیدی مضامین کی دو کتابیں تحریر کیں پہلی کتاب" شعر چیزے دیگر است" 1983 میں شائع ہوئی اور دوسری کتاب" شعلے کی شناخت" جسے نصرت پبلشر نے شائع کی۔ ان کو موسیقی سے والہانہ لگاؤ تھا اس لیے انہوں رجب علی خاں پر پہلے 1982 میں ہندی میں اور 1994 میں اردو میں شائع ہوئیں جو رجب علی خاں کی حیات پر بڑی اہم کتاب ہے۔

اردو کے مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے اس جملے پر اپنی بات ختم کرنا چاہتا ہوں۔

"ادب، فلسفہ، آرٹ، موسیقی، سیاست، تاریخ، تنقید، لسانیات اور مذہب کا شائد ہی کوئی ایسا شعبہ ہوگا جس میں عمیق حنفی ضروری اور غیر ضروری جائز اور ناجائز اہم اور غیر اہم معلومات نہ رکھتے ہوں۔

مجتبیٰ حسین کا یہ قول عمیق حنفی کی شخصیت کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ ہندوستانی رنگوں میں ڈوبا ہوا مصور الفاظ عمیق حنفی کی ادبی خدمات پر جتنا کام ہونا چاہیے تھا ابھی نہیں ہوا۔ محققین کی نظر میں ان کی ادبی خدمات ضرور رمانی جائے تا کہ نئی نسل کی معلومات میں اضافہ ہوسکے۔

❑❑❑

پروفیسر عباس رضا نیّرؔ

شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

9919785172

منور رانا: ماں سے مہاجر نامہ تک

> ’’شکستہ دل اور شکستہ دامن مہاجروں کی ترجمانی جب منور رانا نے کی تو گویا اس منظوم داستان کا ہر شعر ایک نشتر بن گیا جس نے دلوں پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ لوگ خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو گئے۔ عظیم ملک ہندوستان کی تقسیم اور ر تقسیم کے بعد ہجرت کے المیے کو منور رانا نے طویل غزل کی ہیئت میں پیش کیا ہے۔ عموماً ایسے کسی بڑے موضوع کو اردو اور فارسی شعرا نے مثنوی اور انگریزی شعرا نے طویل نظم کی شکل میں نظم کیا ہے۔ ویسے تو اس طرح کی واقعہ نگاری کے لیے اردو کی نثری داستانوں کا کوئی جواب نہیں۔ لیکن منور رانا کی شاعرانہ ہمت وحوصلے کو ہی نہیں بلکہ ان کی فنی مہارت کو بھی سلام ہے کہ انہوں نے ایسے عظیم موضوع کے لیے پہلی بار اس غزل کا سہارا لیا جس میں دو مصرعے میں بات مکمل کر لی جاتی ہے۔ منور رانا کے ’’مہاجر نامہ‘‘ کا کمال یہ ہے کہ اگر الگ الگ ایک ایک شعر پڑھا جائے تو ہر شعر اس طویل واقعے کے کسی ایک وقوع کو بیان کرتی ہوئی ایک مکمل اکائی معلوم ہوتا ہے۔‘‘

منور رانا کا نام ذہن میں آتے ہی اس معصوم بچے کی شبیہ نگاہوں میں گھومنے لگتی ہے جس کی کل کائنات اس کی ماں ہے۔ منور نے اردو شاعری کو روایتی محبوب کے دامن سے نکال کر ماں کے مقدس آنچل سے باندھ دیا۔ ماں کو ان کی شاعری میں ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں محبت کے ایک بالکل ہی انوکھے رنگ کو متعارف کروایا ہے۔ وہ رنگ جو کبھی پھیکا نہیں پڑتا۔ وہ محبت جسے کبھی زوال نہیں آتا۔ اردو غزل میں آج تک کسی شاعر نے ماں پر اتنا نہیں لکھا جتنا منور رانا نے لکھا ہے۔ ان کی شاعری میں ماں اپنے پورے تقدس کے ساتھ نظر آتی ہے اور ماں سے منسوب شعروں میں منور اپنی پوری معصومیت اور فطری محبت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ وہ ماں کی قدموں تلے کی جنت کو حاصل کرنے کے لیے ہر دشوار گزار راستے سے گزرنے کے لیے تیار ہیں۔ محبت کا یہ جذبہ شدت اختیار کر کے جب عقیدت میں ڈھل جاتا ہے۔ تب منور کی شاعری اپنے پورے جوبن پر نظر آتی ہے۔

لبوں پہ اس کے کبھی بددعا نہیں ہوتی
بس ایک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

☆☆☆

حادثوں کی گرد سے خود کو بچانے کے لیے
ماں ہم اپنے ساتھ بس تیری دعا لے جائیں گے

ماں کی محبت کے اس عظیم جذبے نے منور کو ایک منفرد اور انوکھا شاعر بنا دیا ہے جس کی غزلوں میں زلف یار کی نہیں بلکہ ماں کے آنچل کی خوشبو ہے۔ وہ خیال یار کے سہارے نہیں جیتے بلکہ اپنی زندگی کو ماں کی دعاؤں کی مرہون منت مانتے ہیں۔ ماں کی ممتا، ماں کا پیار، ماں کا سپنا، ماں کا تصور اور ان کی دعاؤں کی چادر ان کی شاعری کے بیشتر حصوں کو ڈھانپے نظر آتی ہے۔ یہ وہ ہستی ہے جس نے ان کے لاشعور پر ایسے گہرے نشان ثبت کیے جو ان کی شاعری میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ماں کی قربانیاں، صبر و وفا اور اولاد کے لیے محبت نے منور کے ذہن پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ دیئے۔ ماں کے ایثار وخلوص نے اسے منور کے لیے اس کی عزیز ترین ہستی بنا دیا۔ وہ ساری دنیا کو ماں کی محبت کے ہر نہاں اور عیاں رنگ سے واقف کرانا چاہتے ہیں:

محبت کرتے جاؤ بس یہی سچی محبت ہے
محبت ماں کو بھی مکہ مدینہ مان لیتی ہے

☆☆☆

ذرا سی بات ہے لیکن ہوا کو کون سمجھائے
دیئے سے میری ماں میرے لیے کاجل بناتی ہے

☆☆☆

یہ ایسا قرض ہے جو میں ادا کر ہی نہیں سکتا
میں جب تک گھر نہ لوٹوں میری ماں سجدے میں رہتی ہے

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ منور کی شاعری صرف ماں کے گرد ہی گھومتی ہے، نہیں ایسا نہیں ہے۔ ان کی شاعری کے بہت سے ابعاد و جہات ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ان موضوعات کا احاطہ کیا جو اردو شاعری میں اس سے قبل اتنی اہمیت کے حامل نہیں تھے لیکن منور رانا نے اپنی خلاقیت سے ان موضوعات کو ایسی وسعت بخشی کہ دنیا حیران رہ گئی۔ وہیں دوسری طرف منور نے غزل کے روایتی

موضوعات کو بھی ایسی نئی ندرت کے ساتھ پیش کیا کہ وہ بالکل ہی مختلف شان کے حامل ہو گئے۔

منور اپنی شاعری میں براہ راست عوام سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ ان سانحوں کی بات کرتے ہیں جو بہت سے انسانوں کی زندگیوں میں بیک وقت رونما ہو چکے ہیں۔ وہ صرف اپنے غم میں نہیں ڈوبے رہتے بلکہ پوری انسانی برادری کی تکلیف کو محسوس کر کے انہیں اپنے شعروں میں ڈھالتے ہیں۔

تقسیم ہند کے المیے نے جہاں سیاسی اور تہذیبی سطح پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے وہیں انسانی سطح پر اس نے کتنے ہی خاندانوں کو اجڑنے اور دربدر ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس پر بھی ستم یہ کہ اس کاری زخم پر رونے کی اجازت بھی انہیں ہی تھی جو ہجرت کر کے وہاں چلے گئے تھے۔۔۔۔خوف سا خوف تھا۔۔۔۔۔۔درد سا درد تھا۔ یہاں رہ جانے والوں کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ وطن سے محبت کے صلے میں بھی انہیں ملامت اور نفرت ہی ملی۔ منور لکھتے ہیں:

''کھل کر رونے کا اختیار بھی جاتا رہا کہ ہر آنسو پر فرقہ پرستی اپنی مہر لگانے کو
تیار رہتی۔ خوف اتنا غالب تھا کہ لوگ میت پر بھی اس لیے نہیں روتے تھے کہ کہیں
انہیں پاکستان جانے والوں کا رشتے دار نہ سمجھ لیا جائے۔''

''مہاجر نامہ'' تقسیم ہند کے حادثے سے متاثر ہونے والے انہیں مجبور اور بے کس انسانوں کی منظوم داستان ہے جنہوں نے ہجرت کا کرب سہا ہے۔۔۔۔مسلسل پانچ سو اشعار پر مشتمل اس طویل غزل کا ہر شعر اپنے آپ میں ایک مکمل داستان ہے۔ حالانکہ خود شاعر نے ہجرت کا درد نہیں سہا ہے لیکن اپنے بچپن میں انہوں نے تقسیم کے نتیجے میں ہونے والی بربادیوں کا براہ راست مشاہدہ کیا ہے۔ سیکڑوں خاندانوں کا اجڑنا۔۔۔خونی رشتوں کا بچھڑنا۔۔۔۔۔سہمی ہوئی آنکھوں میں بس جانے والا خوف۔۔۔۔۔۔سیاست کی دھوپ چھاؤں غرض یہ کہ ہر احساس کو لفظوں کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔

''مہاجر نامہ'' ایک فرد واحد کی داستان نہیں ہے بلکہ ایک پوری جمعیت پر گذرے المیے کی روداد خونچکاں ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ تاریخ بھی موجود ہے بلکہ اس دور کا جیتا جاگتا معاشرہ بھی نظر آتا ہے۔ اس نسل کو جو اذیتیں جھیلنی پڑیں اس کا درد و کرب تو ملتا ہی ہے ساتھ ہی اس حادثے کے بعد ذہنوں پر مرتب ہونے والے گہرے اثرات کی بھی بخوبی عکاسی ملتی ہے۔

ہجرت کرنے کے بعد جو لوگ وہاں چلے گئے وہ بظاہر دنیا والوں کی نظروں میں محفوظ ہو گئے لیکن اس ہجرت کے نتیجے میں ان کی ذہنی کیفیت Nostalgic سی ہو گئی جس سے رہائی پانا ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔ وہ جیسے ایک درد مسلسل کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اپنی زمینیں، اپنی مٹی، اپنا وطن، اپنا کوچہ، اپنے در و دیوار، اپنے لوگ، اپنے کھیت کھلیان، اپنی خوشبوئیں، اپنی فضائیں، ایک دم سے یوں چھوڑ کر چلے آنا آسان نہیں ہوتا۔ ایک نئے دیس کو اپنانے کی جتنی بھی کوشش کی جائے اپنی مٹی کی خوشبو کہیں نہ کہیں دامن سے لپٹی ہی رہ جاتی ہے۔ وقت کی گہما گہمی میں یادیں بھلے ہی دھندلی پڑ جائیں لیکن جب کبھی ان لوگوں کے سامنے ہجرت کا تذکرہ کیجیے تو جیسے زخموں سے لہو ٹپکنے لگتا ہو اور بقول رانا:

ہم خود ادھڑنے لگتے ہیں ترپائی کی طرح

منور رانا نے سرحد کے اس پار چلے جانے والوں کے جذبات کی ترجمانی جس دردمندی سے کی ہے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ خود اس کرب سے گذرے ہوں۔ اس مہاجر نامے کا ہر ایک شعر جیسے وہاں چلے جانے والوں کے دل کی آواز ہے۔ جو باتیں، جو اذیتیں، جو تکلیفیں وہ مہاجر لوگ اپنے دلوں میں چھپا کر دنیا والوں کی نظروں میں مضبوط بنے رہے اور اندر ہی اندر گھٹتے رہے، سسکتے رہے، روتے رہے انہیں منور رانا نے مہاجر نامے کی شکل میں گویا مجسم کر دیا۔ یہ داستان ہے ان بدقسمت لوگوں کی جن سے ان کی شناخت چھین لی گئی۔ یہ حادثہ اتنا شدید تھا کہ ان کی قوت گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی۔ وہ کراچی گئے تو لوگوں نے انہیں قبول نہیں کیا۔ اندرون سندھ جا کر خود کو سندھی کہنا چاہا تو سندھیوں نے مذاق بنا ڈالا۔ خود کو مہاجر ہی قبول کر لینا چاہا تو لوگوں نے طعنوں کی بوچھار کر دی، اور پاکستانی شناخت پانے کی خواہش کی تو قدم قدم پر انہیں یاد دلایا گیا کہ ان کی جڑیں ہندوستان میں ہیں۔ وہ جنہوں نے اس قطعہ زمین کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیا وہ اپنی شناخت تک سے محروم ہو کر رہ گئی۔ پاکستان سے محبت میں اپنا گھر بار رشتے ناطے، عزت و ناموس، جان و مال یہاں تک کہ اپنی پہچان تک کھو دینے کے بعد بھی وہ صرف مہاجر ہی رہ گئے۔ بے نام مہاجر۔

انہیں شکستہ دل اور شکستہ دامن مہاجروں کی ترجمانی جب منور رانا نے کی تو گویا اس منظوم داستان کا ہر شعر ایک نشتر بن گیا جس نے دلوں پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ لوگ خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو گئے۔ عظیم ملک ہندوستان کی تقسیم اور تقسیم کے بعد ہجرت کے المیے کو منور رانا نے طویل غزل کی ہیئت میں پیش کیا ہے۔ عموماً ایسے کسی بڑے موضوع کو اردو اور فارسی شعرا نے مثنوی اور انگریزی شعرا نے طویل نظم کی شکل میں نظم کیا ہے۔ ویسے تو اس طرح کی واقعہ نگاری کے لیے اردو کی نثری داستانوں کا کوئی جواب نہیں، لیکن منور رانا کی شاعرانہ ہمت و حوصلے کو ہی نہیں بلکہ ان کی فنی مہارت کو بھی سلام ہے کہ انہوں نے ایسے عظیم موضوع کے لیے پہلی بار اس غزل کا سہارا لیا جس میں دو مصرعے میں بات مکمل کر لی جاتی ہے۔ منور رانا کے ''مہاجر نامہ'' کا کمال یہ ہے کہ اگر الگ الگ ایک ایک شعر پڑھا جائے تو ہر شعر اس طویل واقعے کے کسی ایک وقوع کو بیان کرتی ہوئی ایک مکمل اکائی معلوم ہوتا ہے اور سارا ''مہاجر نامہ'' ایک ساتھ پڑھا جائے تو غزل مسلسل کا لطف آتا ہے۔ اردو شاعری میں بہرحال یہ منور رانا کا منفرد اور اچھوتا تجربہ ہے۔ کتاب ''مہاجر نامہ'' کے پیش لفظ کے طور پر منور رانا کا دیباچہ بھی قابل توجہ ہے۔ تقسیم اور ہجرت کے تلخ حقائق کو سمیٹے ہوئے یہ دیباچہ منور رانا کی نثری شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ وہیں ''مہاجر نامہ'' کے بہت سے اشعار بھی ایسے ہیں جن میں شاعرانہ چاشنی کے ساتھ نثر کی مٹھاس کا بھی لطف آتا ہے۔

''مہاجر نامہ'' کی تخلیق میں منور رانا کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہجرت کے کرب کو محض کسی داستان کے بیانیے کی طرح سے بیان نہیں کر دیا ہے بلکہ اس تقسیم اور ہجرت کے سیاسی اسباب و وجوہات کو نہایت ہی بے باکی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ بین السطور بحیثیت راوی وہ کہتے جاتے ہیں اس تقسیم اور ہجرت سے سرحد کے دونوں طرف کے عوام کو کوئی دلچسپی نہیں تھی یہ تو بعض سیاسی رہنماؤں کے ہوس اقتدار کی دین ہے۔ جس کا فائدہ انگریز حکمرانوں نے دکھایا اور جس کی سزا بھولے بھالے عوام کو جھیلنی پڑی۔ زمینوں کے ساتھ دلوں کا بھی بٹوارا ہوا۔ محبتوں کے رشتوں میں نفرتوں کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ ستیہ اور اہنسا کی دھرتی بے گناہوں کے خون سے رنگین ہو گئی۔ نتیجے میں ملک کی ایک بڑی آبادی کو ہجرت بالجبر کے عذاب سے دوچار ہونا پڑا۔

کوئی بھی مہاجر ہجرت کرتے وقت ہجرت کے انجام کی شکل میں ملنے والی شام غریباں سے بے خبر ہوتا ہے۔ اسے تو ایسا لگتا ہے کہ نئی دنیا کے نئے سویرے اسے آواز دے رہے ہیں۔ اس وقت وہ یہ بات بھی شدت سے محسوس نہیں کر پاتا کہ دعائے سفر پڑھتے وقت اس کے بازوؤں پر امام ضامن باندھنے والوں جنازوں میں بھی شرکت کرنا اب اس کے اختیار میں نہیں رہ جائے گا۔ وہ تو خواجہ حیدر علی آتش کے مصرعوں کی انگلیاں تھام کر سارے عزیزوں کو خدا حافظ کرنے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ وہ تو بس اپنی رو میں گنگناتا جاتا ہے:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتر ہے
ہزار شجر سایہ دار راہ میں ہے

مگر انجام کار پرائے دیس میں جا کر وہ دیکھتا ہے کہ یہاں کے لوگوں نے تو ہمارے آنے کی خبر سنتے ہی سارے شجر سایہ دار کاٹ دیے ہیں۔ نتیجے میں منور رانا کے لہجے میں اپنی گفتگو اس طرح شروع کرتا ہے۔ پانچ سو اشعار پر مشتمل رانا کی موضوعاتی غزل ''مہاجر نامہ'' کا مطلع ہے:

مہاجر ہیں مگر ہم ایک دنیا چھوڑ آئے ہیں
تمہارے پاس جتنا ہے ہم اتنا چھوڑ آئے ہیں

اس شعر میں گزرے وقت کے سبھی ستم پوشیدہ ہیں۔ مطلع کا پہلا لفظ ہی ''مہاجر'' ہے۔ لفظ مہاجر سننا ان لوگوں کے لیے کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اس کا ردعمل بڑے حزن انگیز لہجے میں ظاہر کیا ہے۔ اور یہ لفظ ''مہاجر'' سہنے کے بعد جس بے سروسامانی کا عالم ہوتا ہے اس کی تصویر کشی کرتے ہوئے منور کہتے ہیں:

کہانی کا یہ حصہ آج تک سب سے چھپایا ہے
کہ ہم مٹی کی خاطر اپنا سونا چھوڑ آئے ہیں

ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب میں آنکھیں کھولنے والے لوگوں کے لیے اپنے وطن کی مٹی اور اس کی خوشبو کو بھلانا کتنا مشکل ہوسکتا ہے یہ بات ایک سچا ہندوستانی ہی سمجھ سکتا ہے۔ تقسیم کے بعد جو لوگ یہاں سے وہاں گئے وہ دم آخر تک اپنا ماضی فراموش نہ کرسکے۔ ان کا پیارا بچپن جو ہندوستان کی گلیوں میں گزرا تھا جہاں سرسوں کے کھیت لہلہاتے تھے، املی، جامن اور شہتوت کے پیڑوں میں جھولے ڈالے جاتے تھے۔ صبح کی اذان کے ساتھ مندروں میں گھنٹیاں بجتی تھیں جن کی آواز اب تک ان کے کانوں میں گونجتی ہے۔ کہیں گھاٹ، کہیں چوپال، کہیں اردو، کہیں ہندی، ہندو مسلم کی وہ محبت و الفت وہ یاد کرتے اور پچھتاتے رہے۔ سرحد کے اس پار وہ لٹے ہوئے لوگ جنہوں نے ایک قوم اور ایک ملت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردیا وہ آج تک مہاجر کے لقب کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں اور جب ماضی کے جھروکوں سے جھانک کر دیکھتے ہیں تو بیتے وقت کی سنہری یادیں انہیں بے چین کر دیتی ہیں۔

خدا جانے یہ ہجرت تھی کہ ہجرت کا تماشا تھا
اجالے کی تمنا میں اجالا چھوڑ آئے ہیں

☆☆☆

تیمم کے لیے مٹی بھلا کس منھ سے ڈھونڈیں ہم
کہ ہم شفاف گنگا کا کنارا چھوڑ آئے ہیں

منور کہتے ہیں کہ:

”جو لوگ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان گئے وہ بھی اذیت میں مبتلا رہے اور جو ہندوستان میں رہ گئے ان پر بھی غموں کے پہاڑ ٹوٹتے رہے لیکن دونوں کی نوعیت میں فرق ہے۔ منور رانا کے الفاظ میں ہجرت کرنے والوں کو ہجرت کا غم منانے کی اجازت تھی لہٰذا وہ اپنے پچھتاوے، غلط فیصلے یا قسمت کی خرابی پر رو بھی سکتے تھے اور ماتم بھی کرسکتے تھے لیکن اس کے برعکس ہندوستانی مسلمان تقسیم کی شرمندگی سے اتنا ٹوٹ چکے تھے کہ اپنے خاندان کے زیادہ تر لوگوں کے پاکستان چلے جانے کے بعد وہ اپنے گھروں میں ایسا قید ہوئے کہ پھر وہاں سے چار کاندھوں پر سوار ہو کر ہی نکلے۔“

لیکن اہل سیاست کو اس سے کیا لینا دینا؟ انہوں نے اپنے اقتدار کے لیے نہ جانے کتنی گودوں کو اجاڑ دیا، کتنی ہی مانگوں کو سونا کردیا اور کتنے ہی گھروں کو ویران کر دیا۔ ایک ہی ملک کے باشندوں کے درمیان تقسیم کے نام پر سرحدیں حائل ہوگئیں۔ پھر ہجرت کے عفریت نے اپنی تباہ کاریاں شروع کیں تو لوگوں کو بے رحمی سے سرحدوں کے اس پار ڈھکیل دیا۔

منور رانا کی چشم احساس نے ان اندوہناک مناظر کو پوری دردمندی کے ساتھ دیکھا اور اپنے اشعار میں جذب کرلیا۔ وہ غیر منقسم ہندوستان کو ایک خوبصورت شعر تصور کرتے ہیں۔ ایک شاعر کے لیے یہ تصور کس قدر فطری ہے، وہ ایک مہاجر کی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مہاجر اس لیے ہم ہیں کہ اک مصرعے کی صورت میں
یہاں آتے ہوئے ہم ایک مصرعہ چھوڑ آئے ہیں

ظاہر ہے اب ہر شخص ٹکڑوں میں تقسیم اور لہو میں غرق شعر نما ہندوستان کی بربادیوں کا ماتم کرنے پر مجبور ہے۔ پاکستان میں ہر مہاجر یہی محسوس کر رہا ہے کہ جیسے اس کا بچھڑا ہوا ہندوستان اس کو بلا رہا ہے۔

کسی آہٹ پہ بھی فوراً پلٹ کر دیکھنا گھر کو
در و دیوار کو آواز دیتا چھوڑ آئے ہیں

اور جب بچھڑنے والوں کو گھر کے در و دیوار یاد آتے ہیں تو گھر والوں کی یادیں بھی ستاتی ہیں، کھیل کود میں گزرا ہوا بچپن بھی یاد آتا ہے۔ اب ایسی نفسیات چھوٹے بڑے ہر شئے کو تلاش کرتی ہے:

بھتیجی اب سلیقے سے دوپٹہ اوڑھتی ہوگی
وہی جھولے میں ہم جس کو ہمکتا چھوڑ آئے ہیں

☆☆☆

ابھی تک رنگ سارے یاد ہیں اپنی پتنگوں کے
جنہیں ہم پیڑ کی شاخوں میں الجھا چھوڑ آئے ہیں

چنانچہ جہاں ملک کی تقسیم اور لوگوں کی ہجرت کے نتیجے میں خون کے پاکیزہ رشتے ٹوٹ گئے وہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پنپنے والے محبت اور وضع داری کے رشتوں کا بھی خون خرابہ ہوگیا۔ ایسے میں ایک مہاجر کو ساون بھادوں کی رم جھم میں ہنستے کھیلتے ہندوستان کی یاد میں خون کے آنسو رلانے لگتی ہیں۔

منور رانا اس کرب کو اس طرح اجاگر کرتے ہیں:

عقیدت سے کلائی پر جو اک بچی نے باندھی تھی
وہ راکھی چھوڑ آئے ہیں وہ رشتہ چھوڑ آئے ہیں

مہاجر کو ایک طرف غیروں کا کلچر یاد آتا ہے تو دوسری طرف انہیں گہوارۂ علم و ادب لکھنؤ کے ادارے اور مذہبی تقریبات کی بھی بہت یاد آتی ہے۔

محرم کی سبیلیں مرثیے اور آگ پر ماتم
نہ جانے لکھنؤ میں اور کیا کیا چھوڑ آئے ہیں

کبھی وہ رائے بریلی میں علی میاں کا تکیہ یاد کرتا ہے اور کبھی لکھنؤ یونیورسٹی والی گومتی کا کنارا:

جہاں کے عالموں سے ساری دنیا درس لیتی ہے
وہ تکیہ چھٹ گیا ہم سے وہ ندوہ چھوڑ آئے ہیں

پھر ہندوستان سے بچھڑنے والے کف افسوس ملتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ آخر تقسیم کا مقصد کیا تھا اور ہمیں ملا کیا؟

تو کیا تقسیم ہی بنیاد پاکستان ٹھہری تھی؟
ہم اک ٹکڑے کی خاطر ملک سارا چھوڑ آئے ہیں

وہ جنگ آزادی کے لیے اپنی قربانیوں کو یاد کرکے کہتا ہے:

ہمارا خون بھی شامل تھا آزادی کی جنگوں میں
ہم اپنے خون سے لکھا نوشتہ چھوڑ آئے ہیں

مسلمانوں کے لیے ان کے خون سے لکھا آزادی کا وہ نوشتہ ہی ان کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا جسے چھوڑ کر وہ پاکستان چلے گئے۔ جس طرح ان کی قربانیوں پر پردہ ڈالنے والوں کو کھلی چھوٹ مل گئی۔ ہندوستان چھوڑنے کی وجہ سے ان پر مختلف تہمتیں لگیں تو پاکستان میں رہ کر وہ مہاجر کہلائے اور ہمیشہ سوتیلے سلوک کا شکار ہوئے۔ ان کے دلوں کے زخم آج بھی فریاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سیاست ہے، رعونت ہے، عداوت ہے، بغاوت ہے
وبائیں ساتھ لائے ہیں مسیحا چھوڑ آئے ہیں

جب مہاجرین پاکستان جا کر وہاں سیاست کے مختلف پاٹوں کے درمیان پھنسے تو اپنے تلخ تجربات کی بنیاد پر دنیا کی دوسری قوموں کو ترک وطن نہ کرنے کا مشورہ بھی دیتے ہیں:

کسی بھی حال میں اپنے وطن کو چھوڑ مت دینا
ہمارا حال دیکھو ہم گھر اپنا چھوڑ آئے ہیں

احساس جرم انہیں یہ اعتراف کرنے پر مجبور کرتا ہے:

ہمیں تاریخ بھی اک خانہ مجرم میں رکھے گی
گلے مسجد سے ملتا اک شوالہ چھوڑ آئے ہیں

مہاجر نامہ میں جو وصف ہمیں سب سے زیادہ وضاحت اور اپنے پورے شباب پر ملتا ہے وہ ہے جذبات نگاری۔ اس غزل مسلسل کا ہر شعر جذبات نگاری کا مرقع ہے۔ حالات کے جبر کے نتیجے میں ہونے والی منتقلی کے شدید اثرات۔۔۔۔۔ سب کچھ لٹا کر بھی کچھ نہ ملنے کا احساس نارسائی۔۔۔۔۔ اپنے خونی رشتوں کو کھونے کا وہ کرب جس نے ہزاروں انسانوں کو توڑ کر رکھ دیا۔۔۔۔۔ وہ شدت ضبط جب آنکھوں سے آنسوؤں کے بجائے لہو ٹپک پڑے۔ منور رانا نے ان سبھی جذبات کی اتنی حساس اور جزئیہ تصویر کشی کی ہے کہ ذہن میں وہ سارے درد انگیز منظر تازہ ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں بے اختیار اشکبار ہو جاتی ہیں۔۔۔۔۔ آپ بیتی سناتے سناتے اکثر جگہوں پر ان کا لہجہ مزاحمتی اور احتجاجی ہو جاتا ہے، دبا دبا سا معصوم احتجاج۔۔۔۔۔ جس میں ایک فریاد سی چھپی ہوتی ہے۔

ہمارا خون بھی شامل ہے آزادی کی جنگوں میں
ہم اپنے خون سے لکھا نوشتہ چھوڑ آئے ہیں

☆☆☆

بہت چپ چپ سے رہتے ہیں شکایت بھی نہیں کرتے
کہ اے خاک وطن ہم ساتھ تیرا چھوڑ آئے ہیں

اور ان سارے جذبات پر حاوی ہے احساس ندامت۔۔۔۔۔۔ شرمندگی۔۔۔۔ پچھتاوا۔ دکھ سا دکھ ہے کہ اب کف افسوس ملتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ ناسور تو اب ساری زندگی ستائے گا۔۔۔۔۔۔۔ سب کچھ کھو دیا۔۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہ پایا۔۔۔۔۔۔ خالی دل۔۔۔۔۔۔ خالی ہاتھ۔ کس سے کہیں۔۔۔۔۔۔ سارے قصور تو اپنے ہی کھاتے میں نکلتے ہیں۔ لب سی لیے۔۔۔۔۔۔ آنکھیں خشک کر لیں۔۔۔۔۔۔ دل ویران کر لیے۔۔۔۔۔۔ صبر وضبط کی دبیز چادر میں سارے احساسات چھپا لیے۔ لیکن منور نے ایک دھاگا ادھیڑا اور پوری ترپائی کھل گئی جیسے:

یہ ہجرت تو نہیں تھی بزدلی شاید ہماری تھی
کہ ہم بستر پہ اک ہڈی کا ڈھانچہ چھوڑ آئے ہیں

☆☆☆

ہمیں روتے ہوئے وہ لوگ اب بھی یاد آتے ہیں
جنہیں ہم بے سبب اور بے ارادہ چھوڑ آئے ہیں

دنیا بڑے بڑے حادثات اور سانحات سے بھری پڑی ہے لیکن جیسا المیہ ان مہاجروں نے برداشت کیا ہے وہ تاریخ کے سینے پر آنسوؤں اور لہو سے لکھا ہے۔ پاکستان سے محبت کی سزا ان کی تیسری نسل آج تک بھگت رہی ہے۔ اسی داستان غم کو منور نے لفظی تصویروں کے ذریعے جب بیان کیا تو پڑھنے والوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ دکھ، حیرت، رحم، خوف، احتجاج اور صبر کا پیمانہ جب لبریز ہو گیا تو چھلک کر مہاجر نامہ کی شکل میں شکوہ بن کر سامنے آگیا۔ اور اب سوائے اظہار تاسف کے اور بچا ہی کیا ہے:

ہم اپنی بے بسی پر اب کف افسوس ملتے ہیں
کہ خواجہ آپ کا بھی آستانہ چھوڑ آئے ہیں

منور کی یہ طویل داستان فنی اعتبار سے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اس غزل کے ہر شعر میں منور نے ''چھوڑ آئے ہیں'' ردیف کا حیرت انگیز طور پر استعمال کیا ہے۔ قافیے کا بھی اہتمام حیرت انگیز ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں قافیہ پیمائی کرنا بھی آسان نہیں۔ قافیہ ردیف کے دست و گریباں ہے۔ منور رانا کا ذخیرۂ الفاظ اور ہر لفظ کے پیچھے آباد جہاں معنیٰ اپنے قاری کو یقیناً حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

منور رانا نے مہاجر نامہ میں ''کبوتر'' پرندے کا استعارہ بھی بارہا استعمال کیا ہے۔ کبوتر کا ذکر وہ بڑی معنی خیز سادگی سے کرتے ہیں۔ منور رانا کے ''یہاں کبوتر'' کے مختلف معنوی التزام کے ساتھ ایک رعایت یہ بھی ہے کہ ''سید الطیور'' کہا گیا ہے۔ اور لفظ ''سید'' سنتے ہی مظلومیت کی ایک پوری کائنات ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ شعر دیکھئے:

کبوتر اپنے ساتھ چھوڑ کر ہم یوں چلے آئے
کہ جیسے سیدوں کو بھوکا پیاسا چھوڑ آئے ہیں

مہاجر نامہ میں منور نے نہایت سادہ اور دل آویز زبان کا استعمال کیا ہے۔ نہ مشکل قوافی، نہ بھاری الفاظ، نہ رموز وعلائم کی بھرمار۔۔۔۔۔۔ عام روزمرہ میں بولے جانے والے سیدھے سادے الفاظ اور سہل ممتنع کے سے انداز بیان کے ذریعے منور نے اس طویل غزل میں حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم رکھا ہے۔ ہندوستان کے تقریباً ہر شہر اور ہر بستی کا ذکر اور وہاں کی مخصوص چیزوں کے بیان کا منور نے خاص خیال رکھا ہے۔ مہاجر نامہ میں ہندوستان کی بالخصوص گاؤں دیہات کی فضا واضح طور پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ برگد کے پیڑ، تالاب اور گھاٹ، مٹی کے چولہے، چھپر، چھتے، باغ، بغیچے، جیسے الفاظ کے ذریعے منور ایک پر درد تاثر قائم کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔

مہاجر نامہ ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب کا خوبصورت نمونہ ہے۔ یہ تصویروں کا ایک ایسا نگار خانہ ہے جہاں لفظوں کے ذریعے تصویر کشی کی گئی ہے۔ انہوں نے اشعار کے ذریعے ایسی بولتی تصویریں پیش کی ہیں جو رنگوں کی محتاج نہیں ہیں۔ شہر لکھنؤ کی عزاداری، علی گڑھ کی دانش گاہ، دہلی کا لال قلعہ، بھوپال کا تالاب، الہ آباد کا سنگم، ممبئی کا سمندر، جے پور کی چیزیں اور اس کے علاوہ تمام شہروں کی ایسی جیتی جاگتی عکاسی کی ہے کہ آنکھوں کے سامنے غیر منقسم ہندوستان کی تصویر کھنچ جاتی ہے اور زبان کلیجے نہاری ربڑی، امرود، لیچی اور بتاشوں کا ذائقہ محسوس کرنے لگتی ہے۔ ان کی امیجری مہاجر نامے میں اپنے مکمل عروج پر نظر آتی ہے۔

غرض یہ کہ مہاجر نامہ اردو ادب میں طویل نظموں کی روایت میں خاص اہمیت کا حامل ہے کہ یہ صرف ایک جذباتی داستان نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی حقیقت اور اجڑی ہوئی تہذیب کا منظر نامہ ہے۔ یہ ہزاروں تباہ شدہ روحوں کا نوحہ ہے اور ان نادر و نایاب تصویروں کا البم ہے جو وقت کی چکاچوند میں دھندلی ہوتی جارہی ہیں۔ منور نے جیسے انہیں مقدس سمجھ کر ہمیشہ کے لیے اپنے شعروں میں محفوظ کر لینا چاہا ہو کہ جب کبھی کوئی ہجرت کا مارا ٹوٹے دل کا مہاجر اپنے ماضی کے سنہرے ہندوستان کو دیکھنا چاہے گا تو وہ مہاجر نامے کے جیتے جاگتے لفظوں میں پورا منظر دیکھ لے گا اور پھر بے ساختہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا۔

گئے وقتوں کی البم دیکھنے بیٹھے تو یاد آیا
ہم اک چہرے میں اپنا ناک نقشہ چھوڑ آئے ہیں

☆☆☆

سیاست کے بنے اک جال میں ہم پھنس گئے آخر
محبت سے بنایا گھر کا نقشہ چھوڑ آئے ہیں

منور رانا کو اس حقیقت کا شدت سے احساس ہے کہ اگر ماضی میں ہندوستان جیسے قدیم اور عظیم ملک کی تقسیم نہیں ہوئی ہوتی تو آج دنیا کے باقی مشرقی ممالک پر بھی مغرب کی ایسی اجارہ داری نہ ہوتی۔ اور ہماری وہ تہذیب جن کی بنیاد ہی تصوف اور بھکتی پر بھی اس مادیت کا ایسا حملہ نہیں ہوتا۔

''مہاجر نامہ'' منور رانا کی جس قدر کامیاب شعری تخلیق ہے اسی قدر دلکش اور دیدہ زیب اس کی پیش کش بھی ہے۔ پانچ سو اشعار کی یہ ایک غزل ایک سو تیس صفحات پر شائع کی گئی ہے۔ ہجرت کے درد انگیز مناظر کو خیالی تصویروں کے ذریعے بھی پیش کیا گیا ہے۔ سرورق بھی موضوع کا حق ادا کرتا ہے اور پشت پر نوشاد مومن کی عبارت بھی۔ یقیناً مہاجر نامہ منور رانا کا شعری شاہکار ہے۔

❑❑❑

ڈاکٹر فیضان حیدر

شعبۂ اردو وفارسی سی ایم کالج ،قلعہ گھاٹ ، دربھنگہ

7388886628

قاضی عبدالغفار اور ان کا سفرنامہ ’’نقش فرنگ‘‘

قاضی عبدالغفار کا شمار اردو کے اہم نثرنگاروں میں ہوتا ہے ۔وہ ایک بلند پایہ اور ممتاز ادیب ،صحافی ،سوانح نگار اور سفرنامہ نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں ۔انھوں نے اردو فکشن ،سوانح اور صحافت کو نیا رنگ و آہنگ بخشا ،ساتھ ہی سفرنامہ نگاری کے باب میں بھی اہم کارنامہ انجام دیا۔ان کے سفرنامہ ’’نقش فرنگ‘‘ کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ فن سفرنامہ سے پوری طرح واقف ہونے کے ساتھ زبردست قوت مشاہدہ کے مالک بھی ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے سفرنامے میں اشیا اور مناظر کو سرسری نہیں دیکھا بلکہ وہ جہاں سے گزرتے ہیں یا جس چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں اس کی مکمل تصویر پیش کردیتے ہیں ۔آزادی سے قبل جن چند اہم شخصیات نے فکشن کی دنیا میں اپنی تخلیقات کے ذریعہ نام روشن کیا ان میں قاضی عبدالغفار کا نام نامی بھی شامل ہے ۔

قاضی عبدالغفار 1880ء میں مرادآباد کے محلہ تمباکو والا میں پیدا ہوئے ۔حبیب خاں نے ان کا سال ولادت 1885ء لکھا ہے جب کہ قاضی عبدالغفار کی بیٹی فاطمہ عالم علی نے 1889ء بتایا ہے ۔[1] والد کا نام قاضی ابرار احمد تھا۔دہلی میں غدر کے زمانے میں ان کے دادا حامد علی مرادآباد کے قاضی تھے ۔دہلی میں انگریزوں نے کہرام مچا رکھا تھا۔ایک شہزادہ دہلی سے بھاگ کر مرادآباد چلا گیا۔کسی نے اس کو پناہ نہ دی ۔جب قاضی حامد علی کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس کو اپنے یہاں پناہ دے دی ۔انگریزوں کے کارندے ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے ۔چنانچہ اس کی خبر انگریزوں کو ہوگئی ۔ان پر غداری کا جرم عائد کیا گیا۔شہر مرادآباد کے عوام نے ان کو روپوش ہوجانے کی تلقین کی لیکن وہ روپوش نہیں ہوئے اور جواب دیا کہ یہ قوم سے وفاداری کی علامت ہے ۔اب جو ہوگا سو دیکھا جائے گا۔چنانچہ عصر کی نماز کے دوران انگریزوں نے ان کو گرفتار کرلیا اور فی الفور پھانسی دے دی ۔اس وقت قاضی صاحب کے والد قاضی ابرار احمد کی عمر صرف تیرہ برس تھی ۔بعد میں جب ملک کے حالات میں کچھ بہتری آئی اور تفتیش کے بعد ثابت ہوا کہ ان کے دادا قصوروار نہیں ہیں تو انگریزی حکومت نے ان کی ضبط شدہ جائیداد اور مکان واپس کردیا۔قاضی ابرار احمد برطانوی حکومت میں اچھی پکڑ رکھتے تھے ۔چوں کہ ان کا گھرانا زمینداروں کا گھرانا تھا،اس لیے گزربسر بڑی خوش حالی کے ساتھ ہوتی تھی ۔ان کو حکومت کی طرف سے خان بہادر کا خطاب بھی ملا تھا۔

قاضی عبدالغفار کی ابتدائی تعلیم اپنے وطن مرادآباد میں ہوئی ۔انھوں نے 1902ء میں مڈل انگلش کا امتحان دیا اور 1905ء میں گورنمنٹ کالج مرادآباد سے دسویں کا امتحان پاس کیا۔مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے ۔وہاں سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ابھی انٹر کا امتحان پاس ہی کیا تھا کہ ان کے والد نے ان کو واپس بلا لیا اور کسی اعلیٰ افسر کی سفارش سے ان کو نائب تحصیل دار کے عہدے پر مامور کرادیا لیکن قاضی صاحب کو کئی وجوہات کی بنا پر یہ نوکری پسند نہ آئی ۔ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں کہیں دورے پر گئے ہوئے تھے اور اپنا سامان ایک ڈاک بنگلے میں رکھ کر گئے تھے ۔جب واپس آئے تو دیکھا کہ سامان ڈاک بنگلے کے باہر رکھا ہوا ہے اور ایک انگریز افسر کمرے پر قبضہ جمائے ہوئے ہے ۔انھوں نے اس کو طیش میں چھڑی سے اتنا مارا کہ وہ ادھ مرا ہوگیا۔پھر اس نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔سری نواس لاہوٹی اس واقعے کا بیان کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

> ’’جب وہ واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا سامان ڈاک بنگلے میں پڑا ہوا ہے اور ایک انگریز مادرزاد ننگا ان کے کمرے میں براجمان ہے۔اس پر قاضی صاحب کو بڑا طیش آیا اور انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس انگریز افسر کی چھڑی سے اتنی پٹائی کی کہ وہ آگے بھاگ رہا تھا اور قاضی صاحب چھڑی لیے اس کے پیچھے تھے۔جب وہ ادھ موا ہوکر بھاگ نہیں سکا تو ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا۔تب قاضی صاحب نے اس کو چھوڑ دیا اور واپس ڈاک بنگلے آکر اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔‘‘ |2|

’’اس سفرنامے میں صرف وہاں کے مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات ہی درج نہیں کیے گئے ہیں بلکہ ہندوستان کے تعلق سے وہاں کے لوگوں کی سوچ اور ان کے رویے کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے ۔قاضی عبدالغفار کا اصل میدان صحافت ،سوانح اور افسانوی ادب تھا لیکن انھوں نے اس سفرنامے میں سفرنامہ نگاری کے جوہر بھی دکھائے ہیں ۔انھوں نے اقصائے مغرب کی سیر وسیاحت کے حالات اور دلآویز تاثرات حسین اور دل کش پیرائے میں بیان کیے ہیں ۔اگرچہ انھوں نے سفرنامے کے اولین صفحات میں ’’نذر عقیدت‘‘ کے عنوان سے اپنے سفرنامے کو اوراق پریشاں قرار دیا ہے ،لیکن جب دلجمعی کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ان اوراق پریشاں میں وہ نظم وضبط ہے جو قارئین کو اپنا گرویدہ بنالیتے ہیں ۔یہ قاضی صاحب کی تحریر کا کمال ہے کہ وہ اپنی بات اس اسلوب اور اس انداز میں کہتے ہیں کہ قارئین مسحور ہوکر رہ جاتے ہیں ۔‘‘

قاضی عبدالغفار کو ابتدا سے صحافت سے دلچسپی رہی۔ کم عمری سے ہی وہ رسائل و اخبارات میں دلچسپی لیتے تھے۔ مراد آباد سے ایک رسالہ ''نیر عالم'' کے نام سے ابن علی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ ان کے ابتدائی مضامین و تخلیقات اسی رسالے کی زینت بنے۔ ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد انھوں نے صحافت پر خصوصی توجہ صرف کی۔ خوش قسمتی سے مولانا محمد علی جوہر نے 1913ء میں ان کو ''ہمدرد'' میں اپنا اسسٹنٹ بنالیا۔ اس دوران انھوں نے قاضی صاحب کی تربیت کی اور صحافت کے گر سکھائے۔ جب پریس ایکٹ کے تحت مولانا محمد علی جوہر کا ''ہمدرد'' بند ہوگیا تو قاضی صاحب کلکتہ چلے گئے۔ وہاں سے ''جمہور'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ اس کے بعد ''ترجمان'' اور ''صداقت'' میں بھی بطور مدیر کام کیا۔ جمہور کو کچھ اعتراضات کی بنا پر حکومت نے بند کردیا تو انھوں نے دہلی سے ایک نیا روزنامہ ''صباح'' کا اجرا کیا۔ اس طرح وہ صحافتی زندگی سے ہمیشہ جڑے رہے۔ 1934ء کے اوائل میں انھوں نے روزنامہ ''پیام'' جاری کیا۔ 1942ء میں قاضی صاحب کو سر مرزا اسماعیل کی سفارش پر حیدرآباد کے محکمۂ اطلاعات کا ناظم مقرر کیا گیا۔ بعد میں وہ لکھنؤ آگئے پھر وہاں سے دہلی منتقل ہوگئے۔

1947ء کے فسادات میں انجمن ترقی اردو کے صدر دفتر میں آگ لگادی گئی، جس سے سینکڑوں اردو کی اہم کتابیں اور کئی اہم، نادر اور نایاب مخطوطات نذر آتش ہوگئے۔ مولوی عبدالحق ان حالات سے مجبور ہوکر پاکستان چلے گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو چوں کہ اس انجمن سے خاص دلچسپی رہی، اس لیے جب ان کو معلوم ہوا کہ اس کے دفتر میں فسادیوں نے آگ لگادی ہے تو انھوں نے فوراً پولیس کے ساتھ اپنے کارندے بھیجے اور بچے کھچے اثاثے کو فوری طور پر دلی کالج کی عمارت میں منتقل کرایا۔ فسادات تھمتے ہی انھوں نے انجمن کی تمام الماریاں اپنے بنگلے پر منگوالیں۔ اس زمانے میں ان کی نظر انتخاب قاضی عبدالغفار صاحب پر پڑی۔ انھوں نے قاضی عبدالغفار کو اس کی سکریٹری شپ پیش کی جسے قاضی صاحب نے بخوشی قبول کرلیا۔ اس کے بعد انجمن کے کام میں تیزی آگئی۔ انھوں نے ''ہماری زبان'' کو دوبارہ زندہ کیا۔ پہلے انجمن کا ترجمان رسالہ ''اردو'' شائع ہوتا تھا جسے مولوی عبدالحق پاکستان منتقلی کے ساتھ اپنے ساتھ لے گئے اور کراچی میں انجمن ترقی اردو کا دفتر قائم کرکے وہاں سے نکالنے لگے۔ اس لیے قاضی عبدالغفار نے اس کا نام ''اردو ادب'' کردیا جو آج بھی پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔

قاضی صاحب اردو کے مجاہد تھے اور اردو کے جائز حق کے لیے اس وقت آواز بلند کی جب ساری طاقتیں اردو کا نام لینے والوں کو ملک دشمن قرار دیتی تھیں۔ [3] انھوں نے ایسے حالات میں اردو کے لیے ان تھک کوششیں کیں۔ وہ بلا کے بے باک اور جرأت مند تھے۔ ان کی جرأت مندی اسی وقت ثابت ہوگئی جب انھوں نے انگریز افسر کی پٹائی کی اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ اردو کو جائز مقام دلانے کے لیے ہمیشہ جدوجہد اور کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے 17 جنوری 1956ء کو اپنی سکونت گاہ ''آفتاب منزل'' میں انتقال کیا اور مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ 18 جنوری کو انجمن ترقی اردو کی طرف سے ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں ذاکر صاحب، عبدالحمید خواجہ، حافظ احمد سعید، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں وغیرہ شریک رہے۔

1921ء میں قاضی عبدالغفار نے خلافت وفد کے سکریٹری کی حیثیت سے انگلستان اور کئی دیگر ممالک کا سفر کیا اور سفر سے واپسی کے بعد ایک سفرنامہ بھی ترتیب دیا جس کا نام ''نقش فرنگ'' ہے۔ اس میں انھوں نے انگلستان اور دیگر مغربی ممالک کی سفری روداد کے ساتھ اپنے تجربات و مشاہدات کو بڑی عمدگی اور برجستگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی پرورش لوح و قلم میں صرف کردی۔ سیاست میں بھی کچھ عرصے تک دخیل رہے۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد ایک درجن سے زائد ہے۔ یہ تصنیفات و تالیفات افسانوی ادب، سوانح اور سفرنامہ کے ساتھ متفرق موضوعات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی اہم کتابوں میں ''لیلیٰ کے خطوط (1934ء)''، ''مجنوں کی ڈائری (1934ء)''، ''تین پیسے کی چھوکری (1934ء)''، ''آثار جمال الدین افغانی (1940ء)''، ''آثار ابوالکلام: ایک نفسیاتی مطالعہ (1949ء)''، ''نقش فرنگ (1924ء)'' اور ''اس نے کہا (1935ء)'' خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

''نقش فرنگ'' قاضی عبدالغفار کے اس سفر کی یادگار ہے جو انھوں نے حکومت برطانیہ کی دعوت پر 1921ء میں کیا تھا۔ وہ سات آدمیوں کے ایک وفد کے ساتھ اس کے سکریٹری کی حیثیت سے گئے تھے۔ اس وفد کے سات افراد حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ہز ہائینس پرنس آغا خاں، سیٹھ چھوٹانی، سید حسن امام، مشیر حسین قدوائی اور قاضی عبدالغفار تھے۔ حکیم اجمل خاں کے کہنے پر قاضی عبدالغفار کو اس وفد کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اس وفد کے انگلستان جانے کا اصل مقصد خلافت ترکی کے مسئلے پر وہاں کے صاحبان اقتدار سے گفت و شنید اور حل تھا۔

اگرچہ اس وفد کے سفر انگلستان سے کوئی کامیابی نہیں ملی اور اس کو مایوس آنا پڑا، کیوں کہ حکومت برطانیہ اپنے موقف پر سختی کے ساتھ قائم رہی تاہم اس کا ادبی فائدہ یہ ہوا کہ قاضی عبدالغفار نے ''نقش فرنگ'' کے عنوان سے ایک سفرنامہ ترتیب دے دیا اور اس میں وہاں جو چیزیں انھوں نے دیکھیں اور جن مقتدر شخصیات سے ملاقاتیں کیں ان کے احوال قلم بند کردیے۔

اس سفرنامے میں صرف وہاں کے مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات ہی درج نہیں کیے گئے ہیں بلکہ ہندوستان کے تعلق سے وہاں کے لوگوں کی سوچ اور ان کے رویے کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ قاضی عبدالغفار کا اصل میدان صحافت، سوانح اور افسانوی ادب تھا لیکن انھوں نے اس سفرنامے میں سفرنامہ نگاری کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔ انھوں نے اقصائے مغرب کی سیر و سیاحت کے حالات اور دلآویز تاثرات حسین اور دل کش پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے سفرنامے کے اولین صفحات میں ''نذر عقیدت'' کے عنوان سے اپنے سفرنامے کو اوراق پریشاں قرار دیا ہے، لیکن جب دلجمعی کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ان اوراق پریشاں میں وہ نظم وضبط ہے جو قارئین کو اپنا گرویدہ بنالیتے ہیں۔ یہ قاضی صاحب کی تحریر کا کمال ہے کہ وہ اپنی بات اس اسلوب اور اس انداز میں کہتے ہیں کہ قارئین مسحور ہوکر رہ جاتے ہیں۔ وہ اپنے سفرنامے کی نسبت رقم طراز ہیں:

> ''یہ نام نہاد سفرنامہ جو محض سرسری مشاہدات کا عکس ہے، میرے اوراق
> پریشاں کا پہلا مجموعہ ہے جو کتاب کی صورت میں شائع ہوتا ہے، اور وہ بھی محض
> اس لیے کہ زبردستی ان متفرق اوراق کو ردی سے نکالا گیا ہے۔ یہ استحصال بالجبر
> ایک ایسے عزیز کا کام ہے جن کے خلاف میری محبت مرافعہ بھی نہیں کرسکتی۔'' [4]

مذکورہ پیراگراف میں انھوں نے جس شخص کا ذکر کیا وہ حکیم اجمل خاں ہیں جنھوں نے بارہا ان سے اصرار کیا کہ سفری یادداشتوں کو کتابی صورت میں مرتب کرکے شائع کرادو۔ چنانچہ انھوں نے بڑی کدوکاوش کے بعد اسے کتابی صورت میں شائع کیا جو ان کی پہلی کتاب بھی ہے۔ دوستوں کا اصرار تھا کہ وطن واپسی کے بعد سفرنامہ ترتیب دیجیے تاکہ آپ کے سفر کی وہ سوغات ہمارے لیے بطور یادگار محفوظ رہے۔ چوں کہ وہ ایک اہم فریضے کی ادائیگی کی غرض سے وہاں گئے تھے اس لیے مقصد ہر وقت ان کے پیش نظر رہتا۔ ذہن مختلف چیزوں کی وجہ سے الجھنوں کا شکار رہتا تھا، اس لیے وہ پابندی کے ساتھ روزانہ کی یادداشت رقم نہ کرسکے۔ انھوں نے اس میں جو تصویریں پیش کی ہیں اگرچہ وہ عجلت اور اختصار کی وجہ سے دھندلا گئی ہیں تاہم انھوں نے زبان و بیان سے ان میں رنگ آمیزی کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے سفرنامے کی بابت پھر لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ ان اوراق کے اندر ایک شخص واحد کے دماغ و دل کی ان کیفیات کا پرتو ہے جو انگلستان، فرانس، سوئٹزرلینڈ و اٹلی کے مناظر کو ایک نظر دیکھتا ہوا گزر گیا، اور جس نے ان ممالک میں کہیں کہیں یورپ کی قومی زندگی کے نور و ظلمت کو بھی دیکھ لیا۔ بس یہ سطور جس نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں وہ ایک معمولی حیثیت کے مسلمان اور ایشیا نژاد کا نقطۂ نظر ہے۔ لکھنے والا تین مہینے تک یورپ میں پھرتا رہا، لیکن ہر قدم پر اس کے مشاہدات خالص ایشیائی نقطۂ نظر پر مبنی رہے۔ جس چیز پر اس کی نظر گئی معاً اس کے ایشیائی تخیل نے اس چیز کو مشرقی معیار پر کس لیا اور اس طرح انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے مغربی تخیل کا (جہاں تک سمجھ میں آسکا) مشرقی تخیل میں ترجمہ کر دیا۔"[5]

سات آدمیوں کا یہ وفد 19 فروری 1921 کو انگلستان کی طرف روانہ ہوا۔ قاضی صاحب نے اس سفرنامے کی یادداشتیں بھی سفر کے دوران تیار کر لی تھیں لیکن مصروفیات کی وجہ سے اس کی اشاعت بروقت عمل میں نہ آسکی۔ اس کے بعد بھی وہ دوسری بار یورپ کے سفر پر گئے لیکن یہ سفرنامہ ان کے پہلے سفر کی یادگار ہے جو انھوں نے وفد کے ساتھ کیا تھا۔ البتہ اس کی تکمیل 4 جون 1922ء کو دوسرے سفر کے دوران ہوئی جب ان کا جہاز جزیرۂ کریٹ سے گزر رہا تھا۔ انھوں نے بلند و بالا عمارتوں اور ان کے نقش و نگار کو دیکھا، آثار قدیمہ، ہوٹل، قہوہ خانے، ناچ گھر، رقص و سرود کے ہنگامے، محدود جغرافیائی قومیت، گوروں کے کالوں سے تعصبات، ان کی اخلاقی پستیاں غرض تمام چیزوں کو دیکھا اور جن چیزوں کا بیان ضروری سمجھا اسے ہو بہو پیش کر دیا۔ انھوں نے سفر کے دوران چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان سے ان پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کا بیان برجستگی سے کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"۔۔۔لیکن بتانا صرف یہ ہے کہ ایک کالے رنگ کا انسان گورے ملکوں کی اس زندگی سے کس طرح متاثر ہوا۔ ہر سطر جو ان اوراق میں آپ پڑھیں اسی اصول کے ماتحت ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ ان سطور کے لکھنے والے کو نہ جہاں گرد سیاح سمجھا جائے نہ پرگو اور ہمہ داں مصنف تصور کیا جائے۔ نہ معاملہ فہم ماہر سیاست یا زمانہ شناس مدبر قرار دیا جائے۔ بلکہ صرف یہ سمجھ لیا جائے کہ ایک شخص واحد جو ہندوستان میں پیدا ہوا اور سن شعور کو پہنچا۔ جس نے ہندوستانی اور مسلمان ماں باپ کی آغوش میں پرورش پائی اور اپنی ہندوستانی سوسائٹی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔"[6]

لوگ اپنے سفر کی تیاری ہفتوں اور مہینوں کرتے ہیں لیکن ان کی خانہ بدوشی کا یہ عالم تھا کہ 18 کی شام کو بمبئی پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ 19 کی صبح کو روانگی ہے۔ صبح کو سمندر کے ساحل پر ان کے احباب اور اعزا رخصت کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ رخصتی کے وقت ان کو پھولوں کے مالوں سے لاد دیا گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اتنے پھولوں سے لاد دیا گیا کہ دم گھٹ رہا تھا اور میں اپنی زندگی میں اب تک استعمال کیے گئے پھولوں کا حساب کروں تو شاید پوری زندگی اتنے پھول میں نے نہیں استعمال کیے تھے جو آج میرے بدن پر لاد دے گئے۔

جہاز پر سوار ہونے کے بعد ان کو مغرب کی عریانیت کے نظارے دیکھنے کو ملے۔ وہ ناچ گانوں اور رقص و سرود کے ہنگاموں سے دور ایک پاکباز زندگی گزارنے کے خوگر تھے جس میں مشرقی تہذیب و تمدن کی آب و تاب موجود تھی۔ اس لیے جہاز کے عریاں مناظر، لوگوں کی خوش گزرانیاں، مشرقی عورتوں کی مغرب زدگی غرض مغرب کے وہ تمام ہنگامے جو وہاں کے سماج و معاشرے کا حصہ اور ان کی اخلاقی پستی کا باعث ہیں، سب ان کو یہاں دیکھنے کو ملے۔ اکثر شرم کے مارے وہ خود اپنی نظریں جھکا لیتے، ان کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ خود خطاوار ہیں اور ایسے وقت میں ان کو اردو کے مشہور شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب یاد آتے کہ اگر انھوں نے اس جنت نگاہ اور فردوس گوش کو دیکھا ہوتا تو ان کی "چو گوشیہ" سطح سمندر کی لہروں پر رقصاں نظر آتی۔ گویا یہاں پر عیش و عشرت کی ہر جنس موجود تھی۔ خصوصاً جب رات ہو جاتی تو جہاز کو روشنی سے بقعۂ نور بنا دیا جاتا۔ جہاز کے گوشے کہیں کہیں تاریک بھی رہتے۔ ایسے میں باریک ریشم کے اندر سے گورے گورے بدن کی سفیدی جھانکتی ہوئی نظر آتی اور سینوں پر جواہرات کا عجیب سماں ہوتا۔ وہ ان کرشموں کا بیان کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

"کرشموں اور تجلیوں کا وقت ہمیشہ سے وہی ہے۔ جب سورج کی روشنی باقی نہ رہے۔ یوں تو جہاز مغرب کے بعد بھی بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنا دیا جاتا ہے مگر پھر بھی عرشہ کے بہت سے کونے تاریک رہتے ہیں! جب بجلی کی روشنی میں باریک ریشم کے اندر سفید جسم جھلک چکیں اور کھلے ہوئے سینوں پر جواہرات اپنی دمک دکھا چکیں تو پھر تاریک گوشوں کا سکون کس قدر عزیز ہوتا ہے! شب کے دسترخوان پر جہاز کی ساری پونجی سفید کھال، باریک کپڑے، خوب صورت بال، درخشاں جواہرات۔ ان سب کی ڈھیریاں لگی ہوتی ہیں۔"[7]

پانچویں دن جہاز عدن پہنچا۔ انھوں نے عدن کی سرزمین پر قدم رکھا۔ وہاں کچھ مسافر جہاز سے اترے اور کچھ نئے مسافر سوار ہوئے۔ یہاں پر جابجا حبشیوں کے گھر نظر آ رہے تھے۔ یہاں کے کوچوں اور بازاروں میں حبشیوں کی ریل پیل نظر آ رہی تھی۔ ان کی نظریں اس بلالیت کو تلاش کر رہی تھیں جنھوں نے رسول (ص) کی صحبت میں رہ کر دین اور دنیا دونوں میں سرخ روئی حاصل کر لی۔ آج دنیا حضرت بلال کا نام بڑے احترام سے لیتی ہے۔ ان کی آواز میں اذان سننے کی رسول کی بیٹی فرمائش کرتی تھیں۔ وہاں جا کر انھوں نے حبشیوں کے حالات ناگفتہ بہ دیکھے۔ وہ شہر سے ساحل اور ساحل سے شہر تک مسافروں کے پیچھے پیچھے گھومتے نظر آئے کہ شاید ان سے کچھ پیسے خیرات کے حاصل ہو جائیں۔ جب ان کے ہاتھ لوگوں کی طرف بڑھتے تو قاضی صاحب کا سر آسمان کی جانب اٹھ جاتا کہ خدایا یہ ہاتھ جو خیرات لینے کو بڑھ رہے ہیں کیا وہی ہیں جو صدیوں پہلے دوسروں کو دینے کے لیے بڑھتے تھے۔ حبشیوں کی یہ حالت دیکھ کر ان کو بڑا افسوس ہوا۔ وہاں انھوں نے بہت سے عرب دولت مندوں کو بھی دیکھا جو موٹروں پر اڑ رہے تھے۔ انھیں بڑا تعجب ہوا کہ وہ مذہب جو لوگوں کو مساوات کی تعلیم دیتا ہے اس کے پیروکاروں میں اس قدر نابرابری اور عدم مساوات پھیلی ہوئی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"بہت سے دولت مند عرب بھی دیکھے جو اپنی موٹروں میں اڑتے پھر رہے تھے۔ کیا یہ بھی عہد نبوت کے ان شتربانوں کی نسل ہے جو ناقۂ رسالت کی ڈوری پکڑ کر چلتے تھے؟ کیا وہ بھی طارق کی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہونے والوں کے اخلاف ہیں جو جہاز کے سامنے پانی میں غوطے لگا رہے تھے کہ شاید کوئی مسافر ایک پیسہ پھینک دے۔"[8]

جب ان کا جہاز سسلی سے گزرا تو اس کی اسلامی شان و شوکت نظروں میں پھر گئی جو کبھی دنیائے اسلام کے لیے قابل فخر سمجھی جاتی تھی۔ وہاں انھوں نے جو لمحات گزارے بڑے رقت

آمیز، عبرت، ندامت اور شرم وغیرت کے لمحات تھے۔ انھوں نے اسپین میں مسلمانوں کی شان و شوکت کے مقبرے تو ابھی نہیں دیکھے لیکن سسلی کو دیکھ کر ان کے جذبات امڈ پڑے۔ جہاز جب تک اس کے ساحل پر ٹھہرا رہا تب تک ان کی نظریں اس خاک پر جمی رہیں اور ان کا دل کہتا کہ خدایا اس ورق پر عہد رفتہ کی شان وشوکت کا ایک حرف بھی باقی نہیں۔ 5 مارچ کی صبح کو مارسلیز پہنچے۔ وہاں انھوں نے فرانسیسی زندگی کے نظارے دیکھے۔ اسی دن شام میں پیرس روانہ ہو گئے۔ پیرس میں انھوں نے فرانس کی زندگی کے عمدہ نظارے دیکھے۔ وہاں کے لوگوں کے رہن سہن، رسم و رواج اور صارفیت بھری زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہاں انھوں نے کئی شخصیات سے ملاقاتیں بھی کیں، لیکن چوں کہ اس وفد کا اصل مقصد جلد از جلد لندن پہنچنا تھا اس خیال سے وہ پیرس سے جلد رخصت ہو گئے اور برطانیہ کے دارالسلطنت لندن میں حاضری دی۔

لندن کی کوئی چیز ان کو خاص نظر نہیں آئی۔ وہ وہاں کی زرق برق زندگی اور مادیت پرست قومیت سے تھوڑا بھی متاثر نہیں ہوئے۔ اس سرزمین کو دیکھ کر ان پر یہ تاثر قائم ہوا کہ اگر چہ برطانیہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے انیسویں صدی میں ہی دنیا سے غلامی کو مٹا دیا ہے اور لوگوں کو مساوی حقوق دینے کی کوشش میں رات دن مصروف ہے، لیکن جب وہاں کی صارفیت بھری زندگی کو انھوں نے قریب سے دیکھا تو انھیں احساس ہوا کہ یہاں کے چپے چپے پر غلامی کی بدترین کیفیات موجود ہیں، اقتصادی غلامی، معاشرتی غلامی، سیاسی غلامی اور تہذیبی و ثقافتی غلامی۔ وہ اس غلامی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

> ''اس کی سلطنت کے ہر چپہ پر اقتصادی، معاشرتی، تمدنی، اور سیاسی غلامی کی بدترین کیفیات اہل نظر کے لیے عبرت آموز ہیں۔ غلامی کا کریہہ منظر دیوتا طاقت اور مادیت کے ہر مندر اور شوالہ میں بدستور موجود ہے۔ سوائے اس کے کہ اب اس کو زیادہ خوش آئند اور نظر فریب لباس پہنا دیا گیا ہے۔ اس سرزمین حریت میں میں نے ہر قدم پر اپنی غلامی کے نشان دیکھے۔ سڑکوں پر، ہوٹلوں میں، باغوں میں، ریل میں، جہاز پر، وزارت ہند کے شاندار دفتر میں، وزیر اعظم کے ایوان حکومت میں۔'' [9]

بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ لندن اور یہاں کی ظاہری زرق برق بھری زندگی جو اندر سے بالکل کھوکھلی ہے، اس کا حال بیان کرنا فضول ہے۔ اگر کسی کے پاس روپیوں کی بہتات ہے تو وہ اس سرزمین کو ضرور دیکھے لیکن وہ جس قدر شوق سے آئے گا اس کو اسی قدر یہاں سے مایوس لوٹنا پڑے گا۔ کیوں کہ ہم کالوں (ہندوستانیوں) کا کالا رنگ یہاں کی زرق برق زندگی کی چکا چوند میں اور زیادہ کالا نظر آئے گا۔ اگر کسی کو دنیا کے آثار قدیمہ دیکھنے ہوں تو وہ رومۃ الکبریٰ کے کھنڈرات کا مشاہدہ کرے۔ وہاں کے ایک ایک چپے پر تاریخ کے ہزاروں برس کے نقوش ثبت ملیں گے۔ مناظر فطرت سے لطف اندوز ہونا ہو تو سویٹزرلینڈ کی پر فضا وادیوں کا سفر کیجیے جس سے روح کو فرحت اور دل و دماغ کو تازگی نصیب ہوگی۔ صنعتی اور تجارتی ترقی کا مطالعہ یا اس کے گر سیکھنے کا قصد ہو تو جرمنی کا سفر کیجیے جس کی آج بھی پوری دنیا پر حکومت ہے۔ اگر چہ آج پوری دنیا میں چین کی اشیا سستی قیمت میں دستیاب ہیں اور نچلا اور متوسط طبقہ انھیں سے فیضیاب ہو رہا ہے لیکن جرمنی اپنی اشیا کی گرانی کے باوجود ان کی مضبوطی سے سمجھوتا نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ جرمنی کی اشیا کی دنیا میں آج بھی دھوم ہے۔ پڑھا لکھا اور خوشحال طبقہ جرمنی کا بنا ہوا سامان آج بھی پسند کرتا ہے۔

ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ اگر انسانی فطرت کے کرشمے اور اس کی ادنیٰ و اعلیٰ شعریت دیکھنی ہو تو فرانس کا سفر کیجیے۔ انگلستان ان تمام خوبیوں سے محروم ہے۔ البتہ یہاں کے لوگوں کو سیاست خوب آتی ہے اور وہ جہاں گیری و جہاں بانی کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ انھوں نے ضرورت سے زیادہ اس زمین پر قیام کرنے کو بھی غیر مستحسن خیال کیا۔ اس کے باوجود انھوں نے وہاں کی جن سربرآوردہ شخصیات سے ملاقاتیں کیں ان کے حالات من وعن نقل کر دیئے۔ وہاں ان کی بارگاہ وزارت میں پیشی بھی ہوئی، لیکن ایک تماشے کی صورت میں جو برپا ہوا اور ختم بھی ہو گیا۔ کیوں کہ اس وفد کی مقصد برآوری نہیں ہوئی۔ انھوں نے اس کی پوری تفصیل درج کی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اہل یوروپ ہندوستانیوں کو کس نظر سے دیکھتے اور ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے تھے۔ مصنف نے سفرنامے کے اختتام میں ''ختم کلام'' کے عنوان سے چند اہم معروضات پیش کیے ہیں جو سفرنامے کا ماحصل قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اس میں انھوں نے جن جن مقامات کا سفر کیا ہے ان کے متعلق اپنے تجربات، جذبات و احساسات اور تاثرات کا بیان کیا ہے۔ سفرنامے کا یہ حصہ بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

پورے سفرنامے میں مشرق و مغرب کی کشمکش نظر آتی ہے۔ قاضی عبدالغفار چوں کہ مشرقی تہذیب و تمدن کے پروردہ تھے، اس لیے ان کی مغرب گریز طبیعت کے عناصر پورے سفرنامے میں جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ یہ مشرقیت کہیں کہیں اپنی حدیں بھی توڑ دیتی ہے جس کی وجہ سے مغرب کی خامیوں کے ساتھ کچھ خوبیاں بھی خامیوں میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہیں، جسے ہم قاضی صاحب کی حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت کا پرتو قرار دے سکتے ہیں۔ یقیناً مغربی سماج و معاشرہ صارفیت زدہ ہے۔ اس سے کسی کو انکار ممکن نہیں ہے لیکن نظم ونسق یا انتظامی امور میں ہمیں وہاں کے افراد سے درس حاصل کرنا چاہیے۔ وہ ہر کام کو وقت مقررہ پر انجام دیتے ہیں۔ تساہل یا سہل پسندی ان کو چھو کر بھی نہیں جاتی لیکن قاضی صاحب کو یہ خوبیاں بھی خامیاں نظر آتی ہیں۔

بایں ہمہ ان کا سفرنامہ ایک دلچسپ سفرنامہ ہے۔ اس کا بیانیہ بہت مربوط اور گتھا ہوا ہے۔ قاضی صاحب کو زبان و بیان پر غیر معمولی دسترس حاصل ہے۔ اسی زبان و بیان کی مدد سے انھوں نے اس کے بیانیے میں وہ اثر آفرینی پیدا کر دی ہے جس کو ایک قاری ناول کی طرح دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ لیکن چوں کہ وہ ایک کامیاب صحافی بھی تھے اس لیے وہ اشیا، مناظر اور حقائق کو صحافیانہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کو خبر بنانے اور اس میں کہانی کا عنصر پیدا کرنے کا ہنر ان کو اچھی طرح آتا ہے۔ قوم وملت کے شاندار ماضی کی تاریخ بھی ان کے پیش نظر ہے۔ وہ جن مقامات سے گزرتے ہیں ان کے ماضی میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے اپنے قارئین کو بھی مکمل واقف کراتے ہیں۔ وہ اپنے مشاہدات اور جذبات و احساسات کو بڑی خوب صورت اور سادہ نثر میں پیش کرتے ہیں۔ کہیں کہیں بیانیے میں زور پیدا کرنے کی غرض سے اشعار کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ ایجاز و اختصار اور جزئیات نگاری اس سفرنامے کا خاصہ ہے۔

حوالہ جات:

1۔ اردو ادب، نئی دہلی، خلیق انجم، شمارہ 3۔4، 1995ء، ص 11
2۔ قاضی عبدالغفار، سری نواس لاہوٹی، ہماری زبان، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، یکم ستمبر 1985ء، ص 28
3۔ اردو ادب، نئی دہلی، خلیق انجم، ص 22
4۔ نقش فرنگ، قاضی عبدالغفار، دارالاشاعت پنجاب، لاہور، 1924ء، ص 2
5۔ نقش فرنگ، ص 6
6۔ نقش فرنگ، ص 7
7۔ نقش فرنگ، ص 21
8۔ نقش فرنگ، ص 27
9۔ نقش فرنگ، ص 37

❑❑❑

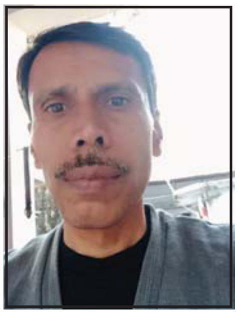

ڈاکٹر راشد میاں

صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، ٹونک

7240302056

اردو کے عظیم سفیر و محسن: پروفیسر گوپی چند نارنگ

گوپی چند نارنگ کا شمار اردو کی عظیم اور محبوب شخصیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ برائے خدمتِ ادب گزار دیا۔ وہ بیک وقت بہترین تخلیق کار و نقاد، دانشور و رجحان ساز، محقق و مدون، فکرِ نو کے موجد، ماہرِ لسانیات، صالح اقدار کے علمبردار، عظیم مرتب و مصنف، نسلِ نو کے رہبر، مزاجاً فصیح و بلیغ و خلیق، ادب کے نیّرِ تاباں، شعریاتِ ہند کے میرِ کارواں، بابائے ادب، اردو کو نئے افکار سے روشناس کرانے والے، ماہرِ تعلیم و تدریس وغیرہ القابات سے نوازے گئے۔

گوپی چند نارنگ نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت سے متعلق ایسے منفرد اور گراں قدر اضافے کئے ہیں کہ اس کی نظیر اردو زبان و ادب کی تاریخ میں شاذ ہی دیکھنے کو ملے گی۔ انہوں نے اپنی حیات کا بیشتر حصہ فروغِ اردو کے لئے وقف کر دیا۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہیں کہ انہوں نے اردو کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ ترویجِ اردو کے سلسلے میں انہوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ متعدد ممالک کے اسفار کیے، اسی لئے بعض اہلِ علم حضرات نے انہیں ''سفیرِ اردو'' کے لقب سے بھی نوازا ہے۔

شاعری ہو یا نثر، تحقیق ہو یا تنقید، تاریخ ہو یا ترجمہ نگاری، صوتیات ہو یا لسانیات، کلاسیکی ادب ہو خواہ رومانی ادب، جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت تمام ادبی روایات و رویوں پر گوپی چند نارنگ کو پورا عبور حاصل تھا۔ حالانکہ اُن کی ابتدائی تعلیم و تربیت اردو کی کسی مشہور بستی یا علاقے میں نہیں ہوئی لیکن وہ اپنی ذہنی استعداد اور خداداد صلاحیتوں کے سبب اردو دنیا میں اس ارفع مقام تک پہنچے۔

آپ کی ولادت بلوچستان کے مقام کودکی ضلع لورالائی میں ۱۱/فروری ۱۹۳۱ء کو ہوئی۔ گوپی چند نارنگ کے اجداد جاگیردار تھے۔ مگر ان کے والدِ گرامی دھرم چند نارنگ نوکری کیا کرتے تھے۔ والدہ محترمہ ٹیکا باتی ایک گھریلو نیک خاتون تھیں۔

۱۹۴۷ء میں وہ اپنی والدہ کے ہمراہ دہلی آگئے تھے۔ یہیں سے آپ نے بی-اے کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا۔ پھر ۱۹۵۸ء میں ''اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی تکمیل دہلی یونیورسٹی سے کی۔ تدریسی مشاغل کی شروعات آپ نے ۱۹۵۷ء میں کیمپ کالج اور سینٹ اسٹیفنز کالج سے کی۔ بعد ازاں دہلی یونیورسٹی میں ریڈر کے عہدے پر ترقی پا کر ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۴ء تک اپنی خدمات انجام دیں۔ آپ کئی یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۱ء کے درمیان جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے شعبہ اردو کے پہلے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے۔ ۱۹۸۲ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے قائم مقام وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۰ء کے اثناء میں نیشنل فیلو، یو جی سی رہے۔ آپ ناروے اور اٹلی کی یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ فیلو کے لئے بھی منتخب ہوئے تھے۔ دہلی یونیورسٹی سے سبکدوشی کے بعد ۱۹۹۶ء سے ۱۹۹۹ء کی میقات میں دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین رہے۔ فروری ۲۰۰۲ء میں ساہتیہ اکادمی، دہلی کے عہدۂ صدر کے لئے مہاشویتا دیوی (جو بنگلہ زبان کی معروف ادیبہ ہیں) اور گوپی چند نارنگ کے درمیان معرکہ ہوا۔ جہاں جنرل کونسل ممبران کے کل ۹۹ ووٹ ڈالے گئے۔ جس میں گوپی چند نارنگ کو ۶۶ ووٹ ملے اور مہاشویتا دیوی کو محض ۳۰ ووٹ ہی حاصل ہوسکے۔ واضح ہو کہ مہاشیوتا دیوی کو اپنے مشہور ناول ''ہزار چوراسی کی ماں'' پر ہندوستانی زبانوں کا سب سے اہم ادبی ایوارڈ ''گیان پیٹھ'' حاصل ہو چکا ہے۔ گوپی چند نارنگ کی یہ فتح نہ صرف تاریخ ساز بلکہ اردو کے لئے یہ سب سے بڑا فخر اس اعتبار سے بھی تھا کہ ان سے قبل اردو سے متعلق کوئی شخص ساہتیہ اکادمی کا صدر منتخب نہیں ہوا تھا۔ اس موقع پر گوپی چند نارنگ کے معروف ہم عصر عظیم ناقد و علمبردارِ جدیدیت شمس الرحمٰن فاروقی رسالہ ''شب خون'' نمبر ۲۶۵ میں اپنی خوشی کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں:

''نارنگ صاحب کے نزدیک اردو صرف ایک زبان اور ادب ہی نہیں صدیوں کی تہذیبی کمائی، وراثت، ثقافتی شناخت، ایک طرزِ حیات، اسلوبِ زیست اور زبانوں کا تاج محل ہے۔ اس ضمن میں وہ تحریر کرتے ہیں: ''اردو کو محض ایک زبان کہنا اردو کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ یہ ایک طرزِ حیات، ایک اسلوبِ زیست، ایک انداز نظریہ جینے کا، ایک سلیقہ و طریقہ بھی ہے۔ اس لئے کہ اردو صدیوں کے تاریخی ربط و ارتباط سے بنی ایک جیتی جاگتی زندہ تہذیب کا ایک ایسا روشن استعارہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال کم از کم برِ صغیر کی زبانوں میں نہیں ملتی۔ اردو میری مادری زبان نہیں، میرے ددیہال اور ننیہال میں سرائیکی بولی جاتی تھی۔ میری ماں دہلی ہجرت کے بعد بھی سرائیکی بولتی تھی جو نہایت میٹھی، نرم اور اصلی زبان ہے۔ لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میری مادری زبان سے دور ہے۔ اردو نے شروع ہی سے دوئی کا نقش میرے لاشعور سے مٹا دیا۔''

”تمام دنیائے اردو کے ادبی حلقوں میں یہ خبر انتہائی مسرت سے سنی جائے گی کہ اردو کے معروف دانشور، مفکر، ماہرِ لسانیات، نقاد اور اردو کی خدمت میں ہمیشہ سینہ سپر رہنے والے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو بھاری اکثریت سے ساہتیہ اکادمی کا صدر منتخب کیا گیا ہے۔ اردو کے کسی ادیب کا ایسے بین اللسانی قومی ادارے کا سربراہ منتخب ہونا اس توقیر کی بھی دلیل ہے جو اردو کو ہمارے معاشرے میں حاصل ہے۔ ہم اپنے دوست کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ اُن کے زمانۂ انتظام میں ساہتیہ اکادمی کا رشتہ اردو سے اور بھی استوار ہوگا۔“

ساہتیہ اکادمی کے صدر منتخب ہونے کے بعد نارنگ صاحب نے اردو سے متعلق جتنے سیمینار وہاں منعقد کرائے، اس سے قبل اس کا عشرِ عشیر بھی کسی اور سے یہاں ممکن نہ ہو سکا۔ کامیاب سیمینار کروانے میں نارنگ صاحب کو جو ملکہ حاصل تھا وہ اب تک شاید کسی کو ہو۔ ان کے ذریعہ دہلی اردو اکادمی اور ساہتیہ اکادمی میں منعقد کرائے گئے سیمیناروں کو نہ صرف تاریخ ساز کامیابی حاصل ہوئی بلکہ ان کی کامرانی کی گونج برسوں علمی و ادبی حلقوں میں رہی۔ نارنگ صاحب کو اردو سے حد درجہ محبت اور لگاؤ رہا ہے۔ خواہ اردو ان کی مادری زبان نہ رہی ہو لیکن یہ زبان اُن کے دل و دماغ پر جادوئی اثر کیسے بنا نہ رہی۔ سیفی سرونجی اپنی مشہور تصنیف ”مابعدِ جدیدیت اور گوپی چند نارنگ“ کے صفحہ ۹ پر نارنگ صاحب کی اردو سے محبت و لگاؤ کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں:

”نارنگ صاحب کی زبان سے جو پہلا لفظ نکلتا ہے وہ ہے اردو زبان۔ دنیا میں کوئی شخصیت مجھے ایسی نظر نہیں آتی کہ جس کے دل و دماغ میں اردو اس طرح رچی بسی ہو کہ وہ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر وقت صرف اردو کے بارے میں سوچتا ہو، اردو ہی جس کا اوڑھنا بچھونا ہو۔“

مذکورہ کتاب میں مزید رقم ہے:

”پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ادبی فتوحات کا احاطہ کرنا کسی ایک اسکالر کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ادبی کارناموں پر الگ الگ لکھنے والے مختلف انداز سے ان پر کتابیں، مضامین اور رسالوں کے خصوصی نمبر شائع کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے لیکن پھر بھی نارنگ صاحب کی شخصیت اور کارناموں کا احاطہ کرنا مشکل ہے کہ ان کا ہر قدم اردو زبان و اب کی خدمت کے لئے اٹھتا ہے۔ آج دنیا بھر میں جو اردو کا چلن عام ہوا ہے، اس میں سب سے بڑا رول نارنگ صاحب کا ہے، جنہوں نے بیرونی ممالک میں اردو کے فروغ کے لئے اپنی تقریروں و تحریروں اور سیمیناروں سے اردو کا چراغ روشن کیا ہے۔ وہ جب بھی لندن، امریکہ، کینیڈا، جرمنی یا پاکستان کہیں بھی جاتے ہیں تو سب سے پہلے اردو زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اردو زبان کی شیرینی اور اس کی مقبولیت کے گیت گاتے ہیں، جنگِ آزادی میں اردو زبان کے رول پر گفتگو کرتے ہیں...... ہر نئی جگہ اردو کے لئے نئی راہیں تلاش کرتے ہیں، اسکولوں، کالجوں میں شعبۂ اردو قائم کرواتے ہیں اور تعریف کی بات یہ ہے کہ وہ نئی نسل کو ہمیشہ اہمیت دیتے ہیں، ان کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں، انہیں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ہر تقریر میں و ہر مضمون میں وہ انہیں یاد رکھتے ہیں۔“

(مابعدِ جدیدیت اور گوپی چند نارنگ، صفحہ ۱۰۔۱۱)

ساہتیہ اکادمی میں ان کی صدارت کے زمانے میں اردو کی متعدد کتب شائع ہوئیں۔ نارنگ صاحب کے نزدیک اردو صرف ایک زبان اور ادب ہی نہیں صدیوں کی تہذیبی کمائی، وراثت، ثقافتی شناخت، ایک طرزِ حیات، اسلوبِ زیست اور زبانوں کا تاج محل ہے۔ اس ضمن میں وہ تحریر کرتے ہیں:

”اردو کو محض ایک زبان کہنا اردو کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ یہ ایک طرزِ حیات، ایک اسلوبِ زیست، ایک اندازِ نظریہ جینے کا، ایک سلیقہ و طریقہ بھی ہے۔ اس لئے کہ اردو صدیوں کے تاریخی ربط و ارتباط سے بنی ایک جیتی جاگتی زندہ تہذیب کا ایک ایسا روشن استعارہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال کم از کم برِ صغیر کی زبانوں میں نہیں ملتی۔ اردو میری مادری زبان نہیں، میرے ددیہال اور ننیہال میں سرائیکی بولی جاتی تھی۔ میری ماں دہلی ہجرت کے بعد بھی سرائیکی بولتی تھی جو نہایت میٹھی، نرم اور اصلی زبان ہے۔ لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میری مادری زبان سے دور ہے۔ اردو نے شروع ہی سے دوئی کا نقش میرے لاشعور سے مٹا دیا۔ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میرے خون میں جاری و ساری نہیں۔ یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اردو میری ہڈیوں کے گودے تک کیسے اترتی چلی گئی، یقیناً کچھ تو جادو ہوگا۔ تاج محل کا کرشمہ مثالی ہے، میں اردو کو زبانوں کا تاج محل کہتا ہوں اور اکثر میں محسوس کرتا ہوں کہ زبان میرے لئے رازوں بھرا بستہ ہے۔“

(اردو زبان اور لسانایت، صفحہ ۱۱۔۱۲)

گوپی چند نارنگ کے ادبی سفر کی شروعات افسانہ نگاری سے ہوئی۔ ان کا اولین افسانہ کوئٹہ شہر کے ہفت روزہ اخبار بلوچستان سماچار میں شائع ہوا۔ وہ ۱۹۵۳ء تک افسانے لکھتے رہے لیکن اسی سال وہ میدانِ تحقیق و تنقید میں مضبوطی سے وارد ہوئے۔ ان کا پہلا مضمون ”اکبر الہ آبادی“ پر ۱۹۵۳ء میں رسالہ نگار میں شائع ہوا۔ یہیں سے آپ کا تحقیقی و تنقیدی سفر شروع ہوا جو تا دمِ آخر جاری رہا۔ آپ کو اپنی تخلیقات و ادبی خدمات کے سبب پے در پے مختلف انعامات و اعزازات سے نوازا جاتا رہا۔ چند اہم اعزازات کی تفصیل اس طرح ہے:

(۱) ۱۹۸۵ء میں نارنگ صاحب کو غالب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ (۲) ۱۹۷۷ء میں انہیں اقبال پر تحقیقی کام کرنے کے عوض پاکستانی حکومت نے نیشنل گولڈ میڈل سے نوازا۔ (۳) ۱۹۹۰ء میں انہیں ”پدم شری“ سے اور ۲۰۰۴ء میں پدم بھوشن سے سرفراز کیا گیا۔ (۴) ۱۹۹۸ء میں انہیں دوحہ (قطر) سے عالمی فروغِ اردو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ (۵) ۱۹۹۵ء میں نارنگ صاحب کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ (۶) ۲۰۱۰ء میں انہیں بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، سال ۲۰۱۱ء میں اقبال سمان، ۲۰۱۲ء میں بھارتیہ گیان پیٹھ مورتی دیوی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اسی طرح ۲۰۰۷ء میں سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد، ۲۰۰۸ء میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۲۰۰۹ء میں وہ ڈی-لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازے گئے۔ ان کے علاوہ بھی نارنگ صاحب متعدد انعامات و اعزازات سے نوازے جاتے رہے۔ تخلیقی اعتبار سے ان کی تقریباً ۶۵ کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ جن میں سات ہندی، بارہ انگریزی اور چھیالیس اردو زبان میں ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ وقعت ہے کہ نارنگ صاحب نے نہ صرف منفرد موضوعات پر کامیاب عالمی سیمینار کروائے بلکہ ان سیمیناروں میں پڑھے گئے مقالات کو کتابی شکل میں عالمانہ مقدموں کے ساتھ شائع بھی کیا۔ نئی نسل کی شمولیت و حوصلہ افزائی ان کے ہر کارِ خیر میں دمِ آخر تک رہی۔ اُن کے ذریعہ کرائے گئے سیمیناروں نے ادب میں جمود و تعطل کو ختم کیا، ادب کے پیچیدہ مسائل حل کئے، ادب میں نسلِ نو کے لئے نئی راہیں ہموار کیں۔ ان کے بعض سیمیناروں کی گونج تو اہلِ علم حضرات اور اردو داں حلقوں میں آج بھی ہے۔ معروف طنز و مزاح نگار نصرت ظہیر نے لکھا ہے:

”میں یہ نہیں کہتا کہ گوپی چند نارنگ کوئی فوق البشر ہیں، ان کی ذات ہر عیب سے پاک اور صاف ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں بہت سی خوبیاں ہیں تو کچھ

خامیاں بھی ہوں گی، سب سے بڑا اُن میں عیب یہ ہے کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں اردو میں ان سے زیادہ حرکتی مجھے کوئی نظر نہیں آتا صرف شمس الرحمٰن فاروقی کچھ قریب دکھائی دیتے ہیں اور وہ بھی اپنے ضخیم ناول کی بدولت جو ضخامت سے بہشتی زیور سے ذرا ہی کم ہوگا۔ تاہم ادبی افادیت میں اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جب میں نارنگ صاحب کے پورے کام کا حساب لگاتا ہوں تو مجھ پر تھرتھری طاری ہو جاتی ہے، اب تک ۷۶ سالہ زندگی میں انہوں نے اتنی کتابیں لکھی ہیں، اتنے مضامین اور مقالے تحریر کیے ہیں اور سیمیناروں اور کانفرنسوں میں اتنے کلیدی اور غیر کلیدی خطبات دے ڈالے ہیں کہ اس سب کو جمع کرکے اردو والوں میں تقسیم کر دیا جائے تو میں سمجھتا ہوں از روئے علم ریاضی اس سے ایک سال میں موجودہ تنقیدی معیار کے ۳۶۵ نقاد پیدا ہو سکتے تھے، البتہ لوند کے سال یعنی Lep Year میں ان کی تعداد ۳۶۶ ہوتی، لہٰذا ہم سب کو مل کر نارنگ صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ انہوں نے اکیلے ہی اتنا کام کرکے اردو کو اتنے سارے مزید نقادوں کی ولادت سے بچا لیا۔''

(بحوالہ مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ: ڈاکٹر سیفی سرونجی صفحہ ۱۷۔۱۸)

نارنگ صاحب کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ بسیار نویسی اور بسیار گوئی کے باوجود ان کا ہر فن پارہ، ہر تقریر اور ہر کتاب جدید ہونے کے علاوہ معیاری اور دلچسپ ہے۔ دراصل وہ ہر بات کہنے کا سلیقہ اور ہنر جانتے ہیں، ان کی کوئی بات بنا دلائل اور حوالوں کے نہیں ہوتی۔ ان کی تقریر ہو یا تحریر سامع اور قاری اس سے لطف اندوز اور مستفیض ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ خواہ کیسا ہی پیچیدہ، مشتعل اور جذباتی موضوع کیوں نہ ہو ان کی تقریر و تحریر میں شائستگی اور سنجیدگی برقرار رہتی ہے۔ مشفق خواجہ اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں :

''پروفیسر نارنگ کو دیکھ کر آپ صحیح معنوں میں خوش ہونا چاہتے ہوں تو انہیں تقریر کرتے ہوئے دیکھئے اور استطاعت ہو تو سنئے بھی۔ میں ان کی تقریر کا قائل بھی ہوں اور قتیل بھی، جب بولنے کھڑے ہوتے ہیں تو لگتا ہے پوری اردو تہذیب بول رہی ہے۔ لہجہ کی شائستگی وحلاوت، اس کا اتار چڑھاؤ، استدلال کی معقولیت، لفظوں کا انتخاب، خیالات کی فراوانی، بولنے کی روانی، ان سب کے امتزاج کا نام پروفیسر نارنگ ہے۔ ہمارے پاس ایسے مقرر تو بہت ہو سکتے ہیں، جو بولتے ہیں تو پھول جھڑتے ہیں، پروفیسر نارنگ بولتے ہیں تو منہ سے پھول ہی نہیں پھل بھی جھڑتے ہیں، یعنی جو باتیں وہ کہتے ہیں وہ کارآمد، پرمغز اور مفید بھی ہوتی ہیں۔.......... میں نے انہیں بعض لوگوں کی اشتعال انگیزی کے بعد بھی خیال انگیزی کرتے ہوئے سنا ہے، تہذیب اور شائستگی کا دامن ان کے ہاتھ سے آج تک نہیں چھوٹا۔''

(بحوالہ گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت صفحہ ۶۔۷)

۲۰۰۴ء میں جب انہیں پدم بھوشن کے اعزاز سے صدر جمہوریہ ہند نے نوازا، تو یہ موقع ان کے اور اردو کے لئے کسی توقیر و عظمت سے کم نہ تھا۔ ممتاز ادیب صلاح الدین نے ''استعارہ'' کا ایک شمارہ نارنگ صاحب کو منسوب کرتے ہوئے لکھا :

''بالعموم کسی دانشور یا نقاد کے حصے میں ایسا وقیع اعزاز کم ہی آتا ہے اور جس جرأت و پامردی سے وہ اردو زبان و ادب کے لئے سینہ سپر رہتے ہیں، اس کے پیش نظر ممتاز ادیب کملیشور کا یہ کہنا مبالغے پر نہیں بلکہ حقیقت بیانی کے ذیل میں آئے گا۔ ہندوستان کی ہر زبان میں ایک گوپی چند نارنگ کی ضرورت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ گوپی چند نارنگ کی وجہ سے نہ صرف ہندوستانی زبانوں کی برادری میں بلکہ عالمی زبانوں کی برادری میں اردو کا سر اونچا ہوا ہے۔ نارنگ صاحب کا یہ اعزاز ان کا تو ہے ہی اردو والوں کا بھی ہے۔''

(بحوالہ مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ، صفحہ ۱۰)

درحقیقت عالمی سطح پر آج اردو کی جو پذیرائی اور قبول عام حاصل ہو رہا ہے تو اس میں دیگر وجوہات سے قطع نظر گوپی چند نارنگ کی کوششوں کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک انٹرویو میں اردو کے لئے سر تسلیم خم کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''اردو زبان کا میں خادم ہوں، اردو میری ضرورت ہے میں اردو کی ضرورت نہیں۔ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو کسی بھی کام کو شہرت کے لئے نہیں کرتے۔ اگر لوگ میری باتوں پر دھیان دیتے ہیں یا جو کچھ میں کہتا ہوں اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے تو یہ میرے قارئین کی محبت ہے۔ اردو سے میرا معاملہ عشق کا ہے اور عشق میں سود و زیاں نہیں ہوتا۔''

(بحوالہ جدیدیت کے بعد صفحہ ۵۵۰)

وہ اپنی تقاریر میں اکثر یہ شعر دہراتے تھے ۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں ۔۔۔ اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اردو کے اس محسن و مربی کو اُن کی بے لوث ادبی خدمات کے سبب اہلِ اردو کبھی فراموش نہیں کریں گے ۔

ماخذ و مراجع :

۱۔ مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ از ڈاکٹر سیفی سرونجی ۲۰۱۲ء
۲۔ اردو زبان و لسانیات : گوپی چند نارنگ ۲۰۰۶ء
۳۔ جدیدیت کے بعد : گوپی چند نارنگ، ۲۰۰۵ء
۴۔ اردو کی نئی بستیاں : گوپی چند نارنگ، ۲۰۰۵ء
۵۔ ماہنامہ عالمی زبان (سرونج) مدیر آفاق سیفی، اکتوبر ۲۰۰۶ء (گوپی چند نارنگ نمبر)
۶۔ شب خون الٰہ آباد : شمس الرحمٰن فاروقی ۲۶۵ نمبر

❑❑❑

گزارش

برائے کرم اشاعت کے لیے اپنی تخلیقات کے ساتھ اپنے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات، بینک اکاؤنٹ نمبر، بینک کا نام و برانچ کا نام، آئی ایف ایس سی کوڈ نمبر ضرور تحریر کریں۔

اس کے بغیر کسی بھی تخلیق کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا۔

Name:-
Account No:-
Bank and Branch Name:-
IFSC No:-

ایڈیٹر نیا دور

منظور احمد گنائی

حسن پورہ باغ، اننت ناگ، کشمیر

6005903959

خطوطِ غالبؔ کا فنی وفکری کینوس

مرزا غالبؔ کی مکتوب نگاری کے فنی وفکری محاسن کا تذکرہ کرنے سے پہلے یہاں اس بات کا تذکرہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خطوط نگاری کا مختصر اور جامع الفاظ میں تبادلہ خیال کیا جائے۔"خط" دراصل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے ڈکشنری معنی "لکیر"، "سطر" یا تحریر کے ہیں لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ لفظ "خط" کے معنی ومفہوم میں بھی تبدیلی آئی اور یہ لفظ مکتوب یا "نامہ" کے معنی میں بھی مستعمل ہونے لگا۔خط یا مکتوب دراصل دو افراد کے مابین ترسیل خیال وافکار کا ایک اہم وسیلہ ہے۔

خطوط عموماً واحد متکلم کے صیغے میں تحریر کیے جاتے ہیں۔اس میں روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جن کا براہ راست تعلق مکتوب نگار یا مکتوب الیہ کی ظاہری ذات سے منکشف ہوتا ہے۔خطوط نگاری کا ایک اہم وصف یہ بھی مانا جاتا ہے کہ اس میں بے ربط واختلاط، منتشر الخیالی کے علاوہ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی اشارے وکنایے بھی ملتے ہیں۔بقول خورشید اسلام:

> "خط حسن اتفاق کا نام ہے اور حسن اتفاق ہی سے یہ ادب کی ایک صنف ہے۔اچھے خط ادبی کارنامے ہوتے ہیں۔۔۔۔خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بنتے جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں دنیا کا لطف ہے۔"

(خورشید اسلام، تنقیدیں۔ص:۹)

دنیا کے اکثر وبیشتر شعراء وادیب اپنی ذات اور شخصیت کو تخلیقات کے پردے میں مخفی رکھنا چاہتے ہیں۔اس لیے جدید تحقیق کی رو سے کسی بھی فنکار کا ذاتی وجود اور مزاج وکردار کے تجزیاتی مطالعے کے لیے اس کی تخلیقات سے کہیں زیادہ مکاتیب معاون ومددگار ثابت ہوتے ہیں۔کیوں کہ مکتوب نگاری ایک ایسا فن ہے جس میں لاکھ چھپانے کے باوجود بھی صاحب تحریر کی شخصیت اپنی تمام تر خوبیوں وخامیوں کے ساتھ نمایاں ہوجاتی ہے۔ایک اچھے خط کی پہچان یہ ہے کہ اس میں غزل کی طرح اختصار وجامعیت، جذبہ واحساس کی فراوانی اور سچائی وخلوص موجود ہو۔اردو میں مکتوب نگاری کی سچی روایت فارسی اصنافِ ادب کی مرہونِ منت ہے۔اردو میں اگرچہ بڑے بڑے شاعروں اور انشا پردازوں نے اس نثری صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن بہت کم مکتوب نگاروں کو قدر ومنزلت حاصل ہوسکی۔اردو میں مرزا غالبؔ، مولانا ابوالکلام آزادؔ، الطاف حسین حالیؔ کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی نے بھی اردو خطوط نگاری میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔لیکن دنیا میں خال خال شخصیتیں ہی ایسی ملتی ہیں جو اپنے حیرت انگیز کارناموں کی بدولت اپنی زندگی میں ہی لیجنڈ کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔مرزا غالبؔ کی شخصیت ایسی ہی ایک عبقری شخصیت تھی جس میں بیک وقت اتنے سارے کمالات وصفات مجتمع ہوگئے تھے کہ کسی بھی زاویے سے ان پر نظر ڈالیے وہ یکتائے روزگار دکھائی دیتے ہیں۔

مرزا غالبؔ ایک کثیر الجہات اور پہلو دار شخصیت کے مالک تھے۔جہاں ایک طرف اُن کی زندگی عیش وآرام سے گزری لیکن وہیں دوسری طرف انہیں کٹھن حالات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔اُن کی زندگی متنوع خصوصیات سے پُر ہے۔اس وسیع وعریض کائنات میں جہاں وہ ایک عظیم شاعر کے طور پر اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔وہیں دوسری طرف اردو نثر میں ایسے موتی بکھیر دیے کہ بڑے سے بڑے زودنویس نثر نگار بھی ان کی فکری وفنی کمالات وصفات دیکھ کر حیران وششدر ہو کر رہ گئے۔اگر انھوں نے شاعری نہ بھی کہ ہوتی اور صرف اردو خطوط ہی لکھے ہوتے تب بھی تاریخ ادب اُردو میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔غالبؔ کے خطوط کے متعدد مجموعے وقتاً فوقتاً شائع ہوئے لیکن ان میں بہت کم مجموعوں کو فنی ریاضت واہمیت حاصل ہوئی۔"مہر غالب" مرتبہ عبدالغفور سرور (۱۸۶۲ء)، "انتخاب غالب" (۱۸۶۶ء)، "عود ہندی" مرتبہ منشی ممتاز علی خان (۱۸۶۸ء)، "اُردوئے معلیٰ" مرتبہ حکیم غلام رضا خان (۱۸۶۹ء)، "مکاتیب غالب" مرتبہ امتیاز علی عرشی (۱۹۳۷ء)، "ادبی خطوط غالب" مرتبہ مرزا محمد عسکری (۱۹۳۹ء)، "خطوطِ غالب" مرتبہ مہیش پرشاد (۱۹۴۱ء)، "نادرات غالب" مرتبہ آفاق حسین آفاق (۱۹۴۹ء)، خطوط غالب" مرتبہ غلام رسول مہر (۱۹۵۱ء)، "غالب کی نادر تحریریں" مرتبہ خلیق انجم (۱۹۶۱ء)، "غالب کے خطوط" مرتبہ خلیق انجم (۱۹۸۴ء) کے علاوہ اور بھی

> "غالب نے اپنے اردو خطوط میں جن موضوعات کو برتا ہے اُن میں سے کچھ تو اُن کی ذاتی زندگی سے سروکار ہیں لیکن انھوں نے اپنے خطوط میں اپنے عہد کے مسائل ومباحث خاص طور پر غدر سے پہلے اور غدر کے بعد دہلی کے ابتر حالات کا جو تذکرہ کیا اس کے سوا کہیں اور نہیں ملتی۔غالب نے اپنے خطوط میں جو کچھ لکھا ہے اور جس انداز میں لکھا ہے وہ اُس عہد اور معاشرے کی دھندلی تصویر ہی سہی لیکن غالب کو اُس عہد کے حالات وواقعات سے ضرور سابقہ پڑا ہے۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ غالب خود اُس دور کے ذہنی انقلاب کے چشم دید گواہ تھے اور محض چشم دید ہی نہیں بلکہ اُس دور کی روایات کے ادبی مورخ اور مرقع ساز بھی تھے۔ان ہی وجوہات کی بناء پر اُن کے اردو مکتوبات میں نقوشِ گزراں کی متحرک تصویریں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔"

خطوط متعدد رسالوں اورکتابوں میں شائع ہوئے ہیں۔لیکن اردو نثر میں غالبؔ کے دو خطوط کے مجموعے ''عودِ ہندی'' اور''اردوئے معلّی'' زیادہ معروف ہیں۔

غالبؔ کا شمار جدید نثر کے معماروں میں ہوتا ہے۔ابتدائی زمانے میں وہ اپنے احباب واقارب کو فارسی میں خط لکھا کرتے تھے۔لیکن بہادر شاہ ظفرؔ کی ایما پر جب انہیں مغلیہ سلطنت کی تاریخ لکھنے کا کام دیا گیا تب ضعیفی اور عدیم الفرصتی کی وجہ سے انھوں نے فارسی کے بجائے اردو میں دوستوں کو خط لکھنے شروع کیے۔اس بات کا تذکرہ مولانا الطاف حسین حالیؔ نے یادگار غالب میں اس طرح کیا ہے:

''وہ (غالبؔ) فارسی تحریریں بڑی محنت اور کاوش سے لکھا کرتے تھے۔اب اس کاوش کے ساتھ خطوط فارسی پر محنت کرنا دشوار تھا اس لیے اردو میں خط وکتابت شروع کر دی۔''

(مولانا الطاف حسین حالی، یادگار غالب، ص ۱۹۷)

جب ہم اس دور کے ادبی کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو اس بات کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ اس دور کی مکتوب نگاری پر فارسیت کا غلبہ تھا۔اردو خطوط میں بھی عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ کا استعمال کیا جاتا تھا۔مقفّی ومسجع عبارت آرائی، پُر پیچ اسلوب بیان کے علاوہ مخاطبت کے لیے طویل القاب وآداب کا استعمال بھی عام تھا۔غالبؔ اپنے کلام کے آئینے میں جس قدر مشکل پسند نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے کلام کی جتنی شرحیں کی گئی ہیں کسی اور شاعر کے کلام کی نہیں لکھی گئیں۔جب ہم ان کے خطوط کا مطالعہ کریں تب اس بات کا احساس وادراک ضرور ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے نثر نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں جسے پُر تصنع و پُر تکلف عبارت پسند نہیں تھی۔انھوں نے اپنے خطوط میں اس بات کی حتی الامکان کوشش کی ہے کہ بات چیت کے انداز میں سیدھے سادے اور پُر اثر الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بیان کر دیا جائے۔اس طرح گویا انہوں نے تحریر کو تقریر کا آئینہ اور مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

''چاہتا ہوں کہ کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہہ دوں اور تحریر کو تقریر کا آئینہ بنا دوں۔''

(مکتوب بنام مرزا علی بخش خان)

اس کے علاوہ انھوں نے اور بھی خطوط میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ کم سے کم اور مختصر الفاظ میں اپنی بات کہہ دینی چاہیے۔چنانچہ مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔
ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو۔ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

(مکتوب بنام مرزا حاتم علی مہر)

خطوط نگاری کے آئین واصول مرتب کرنے والوں میں صرف غالب ہی اردو میں اس پر عمل پیرا ہوئے۔فارسی زبان وادب کی ہزار سالہ روایت کو ایک دم نظر انداز کرنا شاید و باید ان کے بس کی بات نہیں تھی اور وہ بھی اس خواہش کے ساتھ کہ خود ان کا شمار امیر خسرو کے بعد ہندوستان میں فارسی شعراء کی صف میں ہوتا ہے۔ان کے اردو خطوط میں سادگی، سلاست، بے ساختہ پن اور سماجی زندگی کی عکاسی مل جاتی ہے لیکن ان کے فارسی خطوط اس چیز سے عاری ہیں۔پروفیسر رشید احمد صدیقی نے تو ان کے خطوط کو فنون لطیفہ کا جزو قرار دیا ہے وہ فرماتے ہیں:

''خطوط نویسی کو میں فنون لطیفہ میں جگہ دیتا ہوں لیکن اردو میں اس کی مثال صرف غالبؔ کے خطوط میں ملتی ہے۔حُسن وہنر کا جو اظہار وابلاغ مختلف فنون لطیفہ سے علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔گفتگو کرنے میں ان سب سے بطریق احسن کام لینا پڑتا ہے۔اچھی گفتگو کرنے والے کی گفتگو میں نقش، رنگ، رقص، آہنگ اور شخصیت کی بیک وقت جلوہ گری ملتی ہے۔شخص کی عدم موجودگی میں یہی کرشمہ اس کے خطوط میں نظر آئے گا۔غالبؔ نے جو کہا کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے، اسی رمز کی وضاحت ہے۔''

(غالب نامہ، رشید احمد صدیقی، ص ۲۴۹)

غالب نے نہ صرف فرسودہ انداز کی نثر نگاری کو ختم کیا بلکہ خطوط نگاری میں بھی پرانے انداز کو ترک کیا جس میں طول طویل القاب وآداب کا استعمال کیا جاتا تھا۔اسی لیے ان کے شاگرد رشید مولانا الطاف حسین حالیؔ نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''مرزا کی خط وکتابت کا انداز سب سے نرالا ہے''۔یوں تو غالب کے افکار وخیالات کا نمایاں اظہار ان کی شاعری میں ملتا ہے لیکن اُن کے ادبی ذہن اور شخصی زندگی کی ہو بہو تصویر ان کے اردو خطوط میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اُن کے خطوط ذاتی صفات اور شخصی اظہار کی ایسی مثال ہیں جس کی نظیر مشکل سے مل جائے گی۔

غالب نے اپنے اردو خطوط میں جن موضوعات کو برتا گیا ہے اُن میں سے کچھ تو اُن کی ذاتی زندگی سے سروکار ہیں لیکن انھوں نے اپنے خطوط میں اپنے عہد کے مسائل ومباحث خاص طور پر غدر سے پہلے اور غدر کے بعد دہلی کے ابتر حالات کا جو تذکرہ کیا اس کے سوا کہیں اور نہیں ملتی۔غالب نے اپنے خطوط میں جو کچھ لکھا ہے اور جس انداز میں لکھا ہے وہ اُس عہد اور معاشرے کی دھندلی تصویر ہی سہی لیکن غالب کو اُس عہد کے حالات وواقعات سے ضرور سابقہ پڑا ہے۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ غالب خود اُس دور کے ذہنی انقلاب کے چشم دید گواہ تھے اور محض چشم دید ہی نہیں بلکہ اُس دور کی روایات کے ادبی مورخ اور مرقع ساز بھی تھے۔ان ہی وجوہات کی بناء پر اُن کے اردو مکتوبات میں نقوشِ گزراں کی متحرک تصویریں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔

غالب کی زندگی اور اس کی عظمت کا راز، مولانا حالیؔ کی کتاب ''یادگار غالب'' میں مضمر ہے۔یہ حالیؔ کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس میں غالبؔ کی زندگی کے بصیرت افزا معلومات فراہم ہوتے ہیں۔حالیؔ غیر معمولی تنقیدی بصیرت رکھتے تھے اور اسی تنقیدی زاویۂ نگاہ کے عوض انھوں نے اس بات کا کھلم کھلا اظہار کیا ہے کہ ان کے خطوط میں ناول نگاری کے اجزاء مل جاتے ہیں اس بارے میں ناقدین کی آراؤں کو مستند مانا جائے گا یہاں اس بات کا کوئی عمل دخل نہیں۔مرزا غالب کے مکتوبات میں ناول کے عناصر ملتے ہیں یا نہیں اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں دیا جائے گا لیکن اتنا طے ہے کہ انھوں نے مکتوبات کے ذریعے اردو زبان میں ایسی وسعت فکر اور گہری اسلوب نِگارش پیدا کر دی کہ ان مکتوبات میں ہر قسم کے خیالات، جذبات، کیفیات وترجیحات کو پرونے کی سکت موجود ہے۔اس بات میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ جس طرح ناول میں ہر مضمون اور ہر خارجی مسائل کو بیان کرنے کا مادہ موجود ہے اسی طرح غالب کے خطوط میں فکر وشعور کی بلند آہنگی سے ان کی داخلی اور خارجی زندگی کا ہر پہلو بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔

مرزا غالبؔ تقریباً تمام عمر فارسی زبان وادب کی آبیاری کرنے میں مصروف عمل رہے جس کے واضح اثرات ان کی شاعری اور نثر نگاری پر بھی مرتب ہوئے۔خطوط کا معاملہ ہو یا شاعری کا ،غالب کو اپنی فارسی دانی پر بڑا فخر اور ناز تھا اُن کے بہت سے اردو خطوط میں وہی فکر اور مسائل ومباحث نظر آئے جن کا تذکرہ انھوں نے فارسی زبان وقواعد میں بہت پہلے کیا تھا۔اس کے علاوہ ان کی مکتوب نگاری میں مشاہیرِ فارسی شعراء وشار کے ہلکے پھلکے نمونے بھی ملتے ہیں اور گاہے گاہے فارسی کے ثقیل ومقفّی الفاظ کا سلیس اردو میں ترجمہ کرکے اپنی نگارشات کی تخلیق کیا کرتے تھے۔لیکن اس کے باوجود بھی ان کی مکتوب نگاری کا ایک بڑا حصہ جو روایتی فکر وانداز سے بالکل عاری اور فنی وجمالیاتی پہلو سے کافی اونچا ہے۔اس سلسلے میں مرزا حاتم علی مہرؔ کے نام خط لکھا کہ مُراسلے کو مکالمہ بنانا اور ہجر میں وصال کے مزےُ سے تعبیر کیا گیا ہے۔اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ غالب سچے معنوں میں فارسی کے بڑے عالم اور مسلم الثبوت اُستاد تھے۔جس کا تذکرہ انھوں نے

اپنے خطوط میں جا بجا کیا ہے۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں۔"

(خلیق انجم، غالب کے خطوط، ص ۳۳۶)

یہاں اس بات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا بین ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ وہ اساتذۂ زبان کی پیروی خود بھی کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی اس بات کی تلقین کرتے تھے کہ وہ بھی ان کی تقلید اور پیروی کیا کریں۔ حالیؔ کے علاوہ خود غالبؔ نے بھی اس بات کے اشارے دیے ہیں کہ انھوں نے خطوط میں بعض رسمی لوازمات کو جان بوجھ کر ترک کیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہوسکتا کہ رسمی لوازمات سے اجتناب کرکے اور خطوط کی ادبی و معنوی اہمیت مُراسلہ کو مکالمہ بنا دینے سے ہی بات نہیں بننے والی ہے بلکہ اس کی کامیابی کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے اسلوب اور اظہارِ بیان میں فنی وتہذیبی اور عصری مطالبات کا التزام کس حد تک رکھی ہے۔ دوسری بات ان کے خطوط کی ورق گردانی سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مکتوبات میں موضوع یا نفس مضمون پر زیادہ توجہ صرف نہیں کیا بلکہ اپنی پوری صلاحیت و استعداد مضمون کی طرزِ بیانی پر صرف کرتے رہے۔ اس لیے ان کے خطوط کی اسلوب نگارش سے اُبھرنے والی ظرافت سے خوش طبعی اور تہذیبی بلند خیالی کے پرتو ملتے ہیں۔ تخلیقی صلاحیت و استعداد کے اسی جوہرِ پیکر نے ان کے خطوط میں ادبی حُسن و مذاق کی بوقلمونی پیدا کی ہے۔ اس لیے ان کے خطوط میں احساس کی لچک اور شعور کی پختگی جزوِ لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے خطوط میں اسی ادبی وفنی جوہر کو تا دیر قائم و دائم رکھنے سے اُن کے خطوط کے چھوٹے چھوٹے فقرے اور جملے بھی معنی کی اتھاہ گہرائی لیے ہوئے نمود پذیر ہوتے ہیں۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"مجھ کو دیکھو! نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور نہ تندرست، نہ خوش نہ ناخوش، نہ مردہ نہ زندہ۔ جئے جاتا ہوں باتیں کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت۔ جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت ہے۔ بارے جہاں رہو، جس طرح رہو، ہر ہفتے میں ایک بار خط لکھا کرو۔"

(انتخاب خطوط غالب، غلام حسین ذوالفقار، ص: ۱۱۷)

مکتوباتِ غالب کی اگر درجہ بندی کی جائے تو ان کے خطوط مختلف النوع موضوعات پر مشتمل ہیں۔ کسی میں تذکیر و تانیث کی بحث ملتی ہے تو کسی میں اسما و ضمائر کی۔ کسی خط میں لفظ و معنی کی باریکیوں پر بحث و مباحثہ ملتا ہے تو کسی میں علمی موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ کسی میں تصوف کے خشک موضوع پر فلسفیانہ بیان ہے تو کسی میں تاریخی و تہذیبی وراثت کے مباحث ہیں۔ کچھ خطوط شعر کی اصلاح پر مبنی ہیں تو کچھ بحر و قافیہ کی رنگینی پر۔ کسی میں پنشن کا رونا ہے تو کسی میں فرمائش اور اُس کے پورا نہ ہونے پر۔ غرض وہ کون سا موضوع ہے جسے غالب نے اپنے خطوط میں نہیں برتا گویا غالب کے خطوط میں دنیائے آب وگل باتیں ہیں۔ اس کے باوجود بھی وہ ہر کسی سے چھیڑ چھاڑ کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوط میں کسی کو نہیں بخشا ہے۔ نہ زاہد کو بخشا ہے نہ مُلا کو۔ غرض ان کے خطوط اور کلام میں جنت، دوزخ، عذاب، حور، فرشتہ کا ذکر ملتا ہے۔ مطلب کوئی بھی ان کے طنز سے محفوظ نہ رہا۔

بہرکیف مکتوبات غالب کو منجملہ تین اقسام میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ خطوط جن میں علمی و ادبی مباحث ملتے ہیں جن میں لغت، لفظ اور تذکیر و تانیث، اسلوب و زبان، شعراء و ادباء کے کلام پر تنقیدی رائے اور سوالات کے معقول جوابات وغیرہ۔ ایسے خطوط کو مرزا محمد حسن عسکری نے "ادبی خطوط غالب" کے نام سے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا تھا۔ دوسرے درجے کے خطوط میں وہ خطوط ہیں جن میں مختلف قسم کی معلومات فراہم کی گئی ہے۔ مثلاً دیوان کی اشاعت، تاریخ، تہذیب اور تصوف سے متعلق مباحث، دربار اور پنشن سے متعلق روداد وغیرہ ہیں۔ سوم وہ خطوط جن میں ذات اور شخصیت، انسانی فہم و ادراک، قلبی جذبات و واردات سے متعلق گفتگو ہے جن میں انھوں نے گھریلو حالات اور شراب نوشی کا تذکرہ کیا ہے۔ ایسے تمام خطوط غالب کے نثری اسلوب نگارش اور ان کے فکری و فنی مباحث کے تعین میں سونے پہ سہاگا کا کام کرتے ہیں۔

خطوطِ غالب یا ان کے نثری کلام کا جہاں تک طنز و ظرافت کا تعلق ہے ماہرین فن کے زاویہ نگاہ سے اس میں طنز و ظرافت کی اعلیٰ مثال مل جاتی ہے بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سنجیدہ معاملات میں شوخی اور ظرافت کا دامن نہیں چھوڑا۔ حالیؔ نے یادگار غالب میں غالب کی طنز و ظرافت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

"ظرافت ان کے مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو حیوان ناطق کے بجائے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسن بیان، حاضر جوابی، اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیت میں سے تھا۔"

(حالیؔ، یادگارِ غالب، ص: ۶۶)

غالب کے خطوط کی ایک اور اہم خصوصیت ان کی شوخیٔ تحریر ہے۔ جس کی وجہ سے وہ "کاغذی پیراہن" کو "پیکرِ تصویر" بنا دیتے ہیں۔ گویا وہ سبھی علوم و فنون کی باریکیوں سے واقف تھے اسی لیے وہ بے جان چیز کو جاندار بنا دیتے ہیں۔ حالیؔ غالبؔ کی شوخیٔ تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ چیز جس نے ان کے مکاتیب کو ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنایا ہے وہ شوخیٔ تحریر ہے۔۔۔۔۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوتے ہیں، اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہیں، اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ۔"

(حالیؔ، یادگار غالب، ص: ۱۷۹۔۱۷۸)

مکاتیب غالب میں یوں تو زندگی کے مختلف موضوعات کا احاطہ ہے اور یہاں تک کہ غالب نے زندگی کے نشیب و فراز کا ذکر بڑی عمدگی سے کیا ہے لیکن ان میں بالخصوص خیریت طلبی اور خیریت رسائی کی رسمیات بھی ہیں اور کاروباری معاملات بھی، تعزیت نامے بھی ہیں اور شراب نوشی کے قصے بھی ہیں۔ لیکن ان مکتوبات کا سب سے اہم پہلو عناصر زندگی کی عکاسی ہے۔ ان کے خطوط ان کی شاعری کی طرح فنکارانہ اجتہاد کی نمایاں مثال ہیں۔ انھوں نے عام روش سے ہٹ کر الگ اپنی راہ نکالی۔ فرسودہ روایات سے اجتناب کرنا اور پرانی روایت کو توڑنا ان کا مسلک تھا۔ ان کے مکاتیب کے فنی محاسن اس بات میں پوشیدہ ہیں کہ انھوں نے خطوط کے مکالمے اس خوبی سے پروئے، کہ بڑے بڑے مکتوب نگار اس کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ بعض ناقدین نے اسی فنی خوبی و برجستگی کو ان کی شخصیت اور ان کی ذہنی کیفیت کا راز بتایا ہے۔

مرزا غالبؔ کے خطوط میں ایک جہاں آباد ہے۔ یہ محض فکر و اسالیب کی جدت طرازی نہیں بلکہ ان میں دہلی اور دہلی کی بگڑی ہوئی صورت کو بھی موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بہت سے ناقدین ادب کا یہ ماننا ہے کہ خطوط غالب میں بھی شاعری کی طرح قنوطی عنصر موجود ہے لیکن اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دی جائے گی۔ ان تمام باتوں کے برخلاف غالب زندگی کے بارے میں کوئی قنوطی نظریہ نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی ان کے یہاں زندگی کا وہ تصور ہے جو رجائیت کی جان ہے۔ فرض کریں اگر ان کے کلام و خطوط میں حسرت و ناکامی اور رنج و یاس کا عنصر نظر آتا ہے تو وہ وقتی طور پر کارفرما تھا۔ لیکن اصل میں وہ ہمیشہ پریشان رہے، کبھی وظیفہ کے لیے اور کبھی پنشن کو بحال کرنے کے لیے کلکتہ جیسے دور دراز علاقے کا سفر کرنا ان کے لیے دردِ دل سے کم نہیں تھا۔ زندگی کے ان سارے نشیب و فراز کے باعث بھی انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری بلکہ ان سارے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور سینہ سپر رہ کر سارے چیلینجز کا منہ توڑ جواب دیا۔ ان سارے حادثات و واقعات، قلبی جذبات و احساسات کو ان کی شوخی و ظرافت سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

غالبؔ کے خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد اُن کی ذہانت، وسیع النظری، فراخ دلی، ہمدردی، رواداری، سادگی اور دلجوئی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ غالب کی ذہانت اور فراخ دلی کا ذکر تو حالیؔ نے ''یاد گار غالب'' میں تفصیل سے کیا ہے۔ غالب کے صحن میں ہمیشہ اپاہج، لولے لنگڑے، مسکین، غرباء وغیرہ کی بھیڑ رہتی تھی۔ غالب کی ہمدردی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے مالی مشکلات کے باعث بھی کبھی کسی غریب کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیا بلکہ ہمیشہ ان کی اپنی بساط کے مطابق مدد کیا کرتے تھے۔ غالب ایک وسیع المشرب انسان تھے ان کی رواداری کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جاسکتا ہے جو خط انھوں نے مرزا تفتہؔ کے نام لکھا ہے:

''بندہ پرور! میں تو بنی آدم کا مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرے مانے یا نہ مانے۔''

(اردوئے معلی، حصہ اول۔ ص: ۴۷)

غالبؔ کے خطوط میں اس طرح کی بہت ساری مثالیں ملتی ہیں جن سے اُن کی فکر کی بلندی اور فنی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالب کے خطوط میں ایسے بے شمار جملے اور فقرے ملتے ہیں جس سے زبان، شعر، شاعری، ردیف وقافیہ، بحر واوزان، شخصیت سازی اور علمی وادبی موضوعات کا اعادہ ہوتا ہے۔ ان جملوں میں پوشیدہ فکری وفنی محاسن اور استعجابیت قابل غور ہے۔ اس مختصر سی گفتگو کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب کو ان کے زمانے میں جو قدر و منزلت ملنی چاہیے وہ انہیں نصیب نہیں ہوئی، جس کے وہ حق دار تھے۔ گو کہ غالب کے خطوط میں قدم قدم پر فکری وفنی محاسن موجود ہیں اور یہ فکری وفنی بصیرت ہمیں قدم قدم پر رہنمائی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اکابرین اور مشاہیر ادب کے خطوط کا ایک وصف یہ بھی ہوتا ہے کہ ان میں نو آموزوں کے لیے علمی وادبی مواد کی کثرت ہوتی ہے۔ غالبؔ کے خطوط ہر عہد اور دور کے لوگوں کے لیے ذہنی تفریح اور ادبی ذوق کی آبیاری کرتے نظر آتے ہیں۔ غالب کے خطوط میں جس دنیا کو آباد کیا گیا ہے وہ اُن کی اپنی آباد کی ہوئی دنیا ہے۔ فکر و آگہی کے جو جلوے ان کے خطوط میں موجود ہیں وہ ہمارے لیے ذہنی تفریح کے لیے کوہ نور سے کم نہیں ہے۔

چنانچہ مکاتیبِ غالب کا اجمال لیتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے بالکل درست لکھا ہے:

''غالب کے خطوط کی نثر میں صرف منطقی استدلال ہی نہیں بلکہ اس میں ٹھہرا ہوا جذبہ اور ایک منفرد طرزِ فکر اور احساس ہے جو موج تہہ نشیں کی طرح جاری و ساری نظر آتا ہے۔ ان خطوط میں غالب کی خلاقانہ صلاحیت اور نثر کے ہم آہنگ متوازن شاعرانہ صناعی بھرپور امکانات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان میں تجربات اور احساسات کی رنگا رنگی ہے۔ اجتماعی تجربے بھی ہیں اور ذاتی وارداتیں بھی۔ ایک فرد کی آواز بھی ہے اور پورے عہد کی گونج بھی۔ خطوط غالب اس عہد کے ہندوستان کی تاریخ میں رونما ہونے والی اہم ترین سیاسی، سماجی اور تہذیبی، فکری اور جذباتی تبدیلیوں کا ردعمل بھی ہیں اور ایک فرد کی مایوسیوں، شکستوں اور ناکامیوں کی داستان بھی۔''

(خلیق انجم، غالب کے خطوط جلد اول۔ ص: ۱۴۱۔۱۴۰)

غالب کے خطوط اس اعتبار سے بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان سے غالبؔ کی شخصیت، اُن کی صلاحیتوں اور اُن کے فکری وفنی جاذبیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لیے ان کی شاعری کے علاوہ اُن کے خطوط بھی اُن کی شخصیت اور پوشیدہ صلاحیت کے راز کو آشکار کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ غرض غالبؔ خطوط کی وجہ سے شاید و باید اردو ادب پر غالب رہے اور ان خطوط کے ہم پلہ کسی اور کی مکتوب نگاری کو نہیں رکھا جاسکتا کیوں کہ غالب کے خطوط میں وہ مادہ اور قوت موجود ہے جسے بنی نوع انسان دنیاوی مصروفیات سے نبرد آزما ہو کر ہر زمانے میں نئی مٹھاس اور شیرانی محسوس کرسکتا ہے۔

❑❑❑

غزل

ملاحظہ ہو جنونِ صنم گری پھر سے
عروج پر ہے فنِ دستِ آزری پھر سے

امیر شہر کو ہے زعمِ سروری پھر سے
کرے گا کوئی سکندری پھر سے

پلٹ کے آئے گا پھر برگ و بار کا موسم
جو شاخ زرد ہے، ہوجائے گی ہری پھر سے

مقابلے پہ ترے دشمنوں کے لشکر ہیں
خدا سے مانگ تب وتابِ حیدری پھر سے

حصول عظمت اسلاف کر کہ تیرے حضور
نگوں ہو مہر و ثریا و مشتری پھر سے

خلاف نفس کر ایسا جہاد مردِ خدا
ہو ٹھوکروں میں تری تاج قیصری پھر سے

شریفؔ کاش کسی سمت سے سنائی دے
نوائے خواجہ چشتی و سنجری پھر سے

شریفؔ قریشی
بھوسہ منڈی فتح گڑھ
9044674701

غزل

وہ جب سے دوست میرا ہوگیا ہے
مرا دشمن زمانہ ہوگیا ہے

بظاہر استفادہ ہوگیا ہے
حقیقت میں تو سرقہ ہوگیا ہے

چلا ہے ڈھائی گھر جیسے ہی گھوڑا
سوار اُس پر پیادہ ہوگیا ہے

ہماری آنکھ کیا جھپکی تھی کچھ پل
اِسی عرصے میں کیا کیا ہوگیا ہے

سنا ہے کارنامہ ہے کسی کا
مگر شہرہ کسی کا ہوگیا ہے

ترے آتے ہی مطلع ہو گیا تھا
ترے جاتے ہی مقطع ہوگیا ہے

پرایا کیا بنے گا خیرؔ اپنا
جو اپنا تھا پرایا ہوگیا ہے

رؤف خیر
موتی محل، گولکنڈہ، حیدرآباد
9440945645

غزل

احساس رائگانیٔ جاں بھی نہیں رہا
اب تو حساب سود و زیاں بھی نہیں رہا

یہ بھی ہنر دکھایا ہواؤں کے ہاتھ نے
بجھتے ہوئے دیے کا دھواں بھی نہیں رہا

فرصت تو مل گئی ہے ہمیں کارِ عشق سے
اب کیا کریں کہ کارِ جہاں بھی نہیں رہا

جن کو طلب تھی عشق تری وہ تو جا چکے
اب کوئی تیرا مرثیہ خواں بھی نہیں رہا

دھندلا گئے ہیں سارے تعلق کے آئینے
کیسا یقیں کہ عکس گماں بھی نہیں رہا

باقی نہیں ہے اب کوئی دریا کوئی سراب
اب وہ ہجوم تشنہ لباں بھی نہیں رہا

اسلمؔ صدائیں شور میں تبدیل ہو گئیں
لوگوں میں اب شعور فغاں بھی نہیں رہا

اسلم محمود
چمن گنج کان پور
9935002239

غزل

بطرزِ میرؔ اپنا بھی جو انداز بیاں ہوتا
نہاں جو درد ہے دل میں وہ سب ان پر عیاں ہوتا

تمنا تھی یہی کچھ یوں نظام گلستاں ہوتا
چمن اپنا گل اپنے اور اپنا باغباں ہوتا

بلا کی بھیڑ میں اپنا اکیلاپن قیامت ہے
یہ تنہائی نہیں ہوتی جو کوئی رازداں ہوتا

جلاکر وقت کی یہ دھوپ ہم کو خاک کردیتی
اگر سر پر نہ اس کی رحمتوں کا سائباں ہوتا

یہ دل پرنور ہوجاتا اگر نورِ محبت سے
کوئی لمحہ نہ اپنی زندگی کا رائیگاں ہوتا

اگر دیتی نہ درسِ سرفرازی کربلا ہم کو
جبیں کے سامنے کیا جانے کس کا آستاں ہوتا

نہ لکھتے ہم اگرخونِ جگر سے حالِ دل شیداؔ
ہمارا تذکرہ اہلِ سخن میں پھر کہاں ہوتا

ڈاکٹر شیداؔ اعظمی
مفتی گنج لکھنؤ
9889335567

غزل

مجذوب خیالوں کا یہ سودا نہیں ہوتا
تم نے مجھے یوں عشق میں چھوڑا نہیں ہوتا

اک عمر گزاری شبِ ہجراں میں ہم نے
میں ہوش میں ہوتا تو یہ وعدہ نہیں ہوتا

اے وعدہ فراموش نہ کر وعدہ در امروز
وعدوں کا ترے کوئی بھی فردا نہیں ہوتا

اچھا ہے ترا چشمِ تغافل بھی جہاں میں
ورنہ کوئی اس دہر میں زندہ نہیں ہوتا

بس عشق سے ہی میر تقی میرؔ بنا ہے
دریائے محبت میں کنارہ نہیں ہوتا

خالق میں حیراں ہوں تری حکمتِ کُن پر
گر آدم و حوا کبھی جوڑا نہیں ہوتا

الیاسؔ ذرا ان سے یہ کہہ دو کوئی جا کے
تیرا کبھی اب بزم میں چرچا نہیں ہوتا

محمد الیاسؔ
دہلی یونیورسٹی نئی دہلی
6005412339

رعنا رضوی

چوگوئی۔شراوستی

9696810305

افسانہ

قسمت

گھر میں خوشی کا ماحول تھا، سارے کمرے چمکا دیے گئے تھے، ممی کی طرف سے سخت ہدایات دی گئیں تھیں کہ ثنا کے سامنے کسی بھی طرح کی کوئی بات ایسی نہ کی جائے جس سے کہ اُس کے دل کو کسی بھی طرح کی ٹھیس و تکلیف پہونچے۔ دونوں بہنوں نے امی سے وعدہ بھی لے لیا تھا کہ ثنا آپا کے سامنے اُس کے پاپا سے بالکل بحث نہ کریں اور اپنی شکایتوں کی پوٹلی بھی نہ کھولیں۔ کچھ دنوں کے لیے دونوں بہنوں کی پیاری سی بہن ثنا اپی اپنے مائکے آرہی تھی۔ دوسرے دن گیارہ بجے تک ثنا گھر پر پہونچ جائے گی اس لیے اُس کی دونوں بہنیں گھر کی صاف صفائی میں خوش و خرم لگی ہوئی تھیں، ملکہ بیڈ کی چادر بدل رہی تھی، عالیہ کمرے کے پردوں کو بدل رہی تھی، وہیں صوفیان جو کہ سب سے چھوٹا بھائی تھا کمرے میں اُدھم مچا رہا تھا۔ کبھی بیڈ کی چادر کو ہٹا دیتا اور کبھی دروازہ کو بند کر دیتا، بہنیں اُس پر غصہ کرتیں اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ ملکہ نے بیڈ کی چادر بدلتے ہوئے ممی سے کہا کہ ممی اس میں ایک چھوٹا سا داغ لگا ہوا ہے دوسری چادر دیجئے تو بدل دوں، اُس کی ممی نے کہا کہ اس داغ کو تم نے دیکھ لیا لیکن ثنا کے دل پر جو داغ تم لوگوں نے لگایا تھا اُسے کون دیکھے گا، اُن داغوں کو دیکھو جو تم لوگوں نے اُسے ضدی میل کی طرح لگایا تھا، کتنی غمزدہ ہوئی تھی اور خوب روئی تھی وہ اپنے سسرال جاتے ہوئے، صرف تم لوگوں کی وجہ سے۔ آج ایسا مت کرنا اُس کے ساتھ خاص کر اپنے پاپا کے سامنے یہ ہدایات دیتی ہوئی ملکہ کی ممی باورچی خانہ کی طرف چلی گئیں۔

ساڑھے دس بجے تک بہرائچ والی بس قیصر باغ بس اڈے پر پہونچ جائے گی، لیکن تمہارے پاپا پتہ نہیں کیوں اتنا وقت لگاتے ہیں سجنے اور سنورنے میں، نہ جانے کیوں اللہ نے اِن کو لڑکیاں دے دیں، فقیر کیا جانے ہیرے کی قیمت؟ ملکہ کی والدہ باورچی خانہ سے چلا رہی تھیں، کہ ملکہ اور عالیہ دونوں ایک ساتھ بولیں کہ ممی ہم دونوں بہنیں جا کر بس اسٹینڈ سے آپا کو لے آئیں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سامنے اچانک سے ثنا آگئی اور اپنی ممی کے گلے لگ گئی، ساتھ میں دونوں بہنیں بھی اپنی آپا سے گلے ملیں۔ تم کیسے بس اسٹینڈ سے یہاں تک آئیں، کیا آٹو رکشا کر لیا تھا؟

نہیں ممی مجھے الطاف چچا مل گئے تھے وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اپنی موٹر سائکل سے یہاں تک چھوڑ گئے۔ چلو یہ تو بہت اچھا ہوا الطاف چچا اپنی بیٹی کو بہت چاہتے ہیں۔ ہم تو بس اڈے آنے ہی والے تھے، باہر سے آتے ہوئے ثنا کے پاپا نے کہا لیکن کوئی بھی کچھ نہ بولا۔ ثنا کے پاپا وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور ثنا سے پوچھا کہ بیٹا کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی آنے میں؟ پاپا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ثنا نے کہا نہیں پاپا میں تو آرام سے یہاں تک آگئی۔ سب خاموش ہو گئے تھے کیونکہ پاپا اُن کے بیٹھے ہوئے تھے، بہنوں کی خاموشی بتا رہی تھی کہ اُن کے پاپا کے آجانے سے ماحول پرسکون ہو گیا ہے اس لیے ثنا نے اپنے بیگ سے اپنی بہنوں کے لیے جو گفٹ لائی تھی اُن کو نکالنا شروع کیا جو وہ ایک سال سے اپنی بہنوں کے لیے اکٹھا کر رہی تھی۔ ملکہ یہ لے اپنا بریسلیٹ، اور عالیہ یہ تمہارے لیے میک اپ کٹ، اور صوفیان کے لیے یہ سوئٹر، نیلے رنگ کا سوئٹر ثنا لائی تھی اپنے چھوٹے اور پیارے بھائی کے لیے، جس کی نرم و نازک ٹچنگ کو محسوس کرتے ہوئے ملکہ نے اپنے بھائی صوفیان کو دیا، صوفیان چونکہ سانولا سا تھا جیسے ہی اُس نے اس سوئٹر کو پہنا تو ایسا محسوس ہوا کہ کالی گھٹا کے درمیان آسمان سے چاند نکل آیا ہو، کرسی پر بیٹھے ہوئے ثنا کے والد بھی مسکرا دیے۔ تینوں بیٹیوں کے بعد صوفیان پیدا ہوا تھا جس کی وجہ سے گھر کے لوگ اور خاص کر صوفیان کے پاپا بہت خوش ہوئے تھے، جگہ جگہ منتیں جو مانی گئی تھیں وہ پوری کی گئیں، خوب مٹھائیاں بانٹی تھیں، اور اُن کی زندگی کے سارے منصوبے اپنے بیٹے کے اِرد گرد ہی بُنے جاتے تھے، بیٹیوں کو اپنے پاپا کے سامنے مسکرانے اور ہنسنے جیسی بات سات عجوبہ والی تھی، آج جب اپنے پاپا کو ثنا نے مسکراتے ہوئے دیکھا تو اُن کا سخت رویہ اور بے رخی بھول گئی، اور اس عید میں اُس کو گھر آنا بہت اچھا محسوس ہوا۔

"بیگما باجی کے دل میں تو لڈو پھوٹ رہے تھے کیونکہ لڑکا بھی اچھا تھا، خاندان بھی اچھا تھا، لڑکے کو وہ بہت دنوں سے جانتی تھیں، وہ جلدی جلدی اُٹھیں اور وہاں سے رخصت لی، راستے میں انہوں نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ بتاؤ لوگ کہتے ہیں کہ پڑھنے آئے تھے نماز اور گلے پڑ گئے روزے لیکن یہاں تو الٹا ہو گیا آئے تھے آگ لینے اور مل گئی پیغمبری۔ فاطمہ نے پوچھا ممی آپ کیا کہہ رہی ہیں میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے تب ان کی ممی نے بتایا کہ صوفیان نے تمہارا ہاتھ مانگا ہے، اگر تم راضی ہو تو بتاؤ یہ سن کر فاطمہ نے کہا کہ ممی ابھی تو میں نے شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں ہے اور کسا باجی کا رشتہ ابھی طے ہوا تھا وہاں سے منع ہو گیا ہے اسی غم میں ہم لوگ لگے ہوئے ہیں اور آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ جس پر بیگما نے کہا کہ کیا ہوا سامان کسا کا سارا موجود ہی ہے، نہیں بڑی بہن چھوٹی بہن ہی سہی، سامان بھی خراب نہیں ہوگا تمہاری بڑی بہن کی شادی بعد میں ہو جائے گی۔"

بیٹا تم نے اتنا کیوں خرچ کر ڈالا، مائکہ سے تم کو کچھ نہیں ملے گا، ویسے تو یہ بہت اچھا لگتا ہے لیتے ہوئے ان لوگوں کو لیکن وقت پر تمہارے ہاتھ خالی رہیں تو کیا کروگی؟ مانا کہ ابھی تم ماں نہیں بنیں لیکن ہمیشہ تو ایسا نہیں رہے گا؟ شادی شدہ بیٹی اگر غریب ہو تو مائکہ والے بھی اُسے نہیں پوچھتے، تم کو یہ بات معلوم ہونا چاہیئے۔ میں یہ بالکل بھی نہیں چاہتی کہ مستقبل میں تمہیں اس کے بدلے میں اچھے سے اچھا واپس ہونے کی تمنا جاگے اور جب تجھے کچھ نہ ملے گا تب کیا کروگی؟ ثنا کی ماں نے کہا۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ تمہارے پاپا کا اب کام اچھا نہیں چل رہا ہے۔ زیادہ تر تو گھر پر ہی رہتے ہیں اُسی میں پانچ لوگوں کا خرچ بھی چلانا ہوتا ہے، ملکہ اور عالیہ کو تم جانتی ہی ہو آئے دن کچھ نہ کچھ خرچ رہتا ہے کبھی اسکول کا کوئی سامان، کہیں شادی بیاہ کے پروگرام میں جانا ہوتا ہے۔ آج کل کہیں بھی جاؤ پانچ سو روپے سے کم کیا دیا جائے، کبھی تمہارے خاندان میں اور کبھی ہم لوگوں کے خاندان میں کوئی نہ کوئی پروگرام ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس طرح سے تمہارے پاپا اُدھار لے کر اپنا گزر بسر کسی نہ کسی طرح کر رہے ہیں۔ برا مت ماننا بیٹی یہ سب تم کو سمجھانے کے لیے بتا رہی ہوں، ثنا کی ممی نے اُس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

ثنا کی شادی سے قبل ثنا کے گھر کے حالات بہت اچھے تھے، یہ لوگ سرائے مالی خاں میں رہتے تھے، اور اس کے پاپا کی ایک آرا مشین کی شاپ تھی، اُس میں لکڑیاں آتی تھیں اور کٹا کرتی تھیں، گھر پر بھی ثنا کے پاپا لکڑیاں بھجوا دیتے تھے، محلہ کے لوگ اُن سے چولہا جلانے کی لکڑیاں لے جاتے تھے، لیکن ثنا کی شادی کے بعد جیسے ماحول ہی بدل گیا، جس کی دوکان تھی اُس نے وہ جگہ خالی کرالی اور آرا مشین کا وہاں سے وجود ختم ہوگیا، وہاں پر مارکیٹ بن گئی، ایک چھوٹی سی دوکان ثنا کے پاپا کو ملی لیکن اُس میں وہ کیا کرتے کئی کام کر چکے کبھی بجلی کے سامان کی دوکان کھولی، نہیں چلی، کبھی جنرل اسٹور کی دوکان کی لیکن نہیں چلی تھک ہار کر انہوں نے اُس دوکان کو کرائے پر اٹھا دیا وہی کرایہ آتا تھا جس سے گھر کا خرچ چلتا تھا، اور اب سارا دارومدار صوفیان پر تھا کہ اگر اس کی کہیں نوکری لگ گئی تو گھر کے اخراجات پورے ہو جائیں گے۔

صوفیان اب بی اے کمپلیٹ کر چکا تھا اور روزی روٹی کی تلاش میں روز دفتروں کے چکر لگایا کرتا تھا، وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا اس لیے پرائیوٹ جاب کی تیزی سے اُس کی تلاش جاری تھی، ایک دن ایک وکیل صاحب کے گھر پر اُس کی شام ۶ر بجے سے ۱۰ر بجے تک کی ڈیوٹی لگ گئی جس میں صرف ٹائپ کرنا ہوتا تھا، سینیئر وکیل تھے زیادہ سے زیادہ ٹائپ کراتے تھے، اور چھ ہزار روپے ماہ اُس کو وہاں سے ملتے تھے، یہ تو کہیے کہ وکیل صاحب کا گھر سے پیدل کا راستہ تھا جس کی وجہ سے صوفیان کا کرایہ بچ جاتا تھا اور اُس نے چھ ہزار روپے کو ہی غنیمت سمجھا اور کام کا تجربہ لینا شروع کر دیا، ماں باپ بہت خوش ہوئے تھے جب اُس نے پہلی بار چھ ہزار روپے لاکر اپنی ممی کو دیے تھے، ماں باپ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا کہ اُس کے بیٹے نے کمانا شروع کر دیا تھا، ایک دن ایک اور وکیل کا کام ٹائپنگ کا مل گیا انہوں نے کہا تھا کہ اس کو گھر سے کرلایا کرو اور پی ڈی میں کاپی کر کے اُن کے گھر پہونچا دیا کرو۔ اس طرح دو وکیلوں کا کام کرتے ہوئے صوفیان کے مہینے بھر کی کمائی ۱۰ سے ۱۲ ہزار روپے تک کی ہو جاتی تھی، چونکہ وہ اپنی بہنوں کو بہت چاہتا تھا اس لیے اپنی ممی سے اُس نے کہا تھا کہ اس بار ثنا آپا جب عید پر آئیں گی تو کچھ دن روک لیجیے گا، اور ثنا نے جب اُس کو سوئٹر دیا تھا تو وہ بھی سوچ رہا تھا کہ میں کیا گفٹ میں اپنی آپا کو دوں، اُس نے اپنی ممی سے پوچھا تھا کہ میں کیا لاؤں سمجھ میں نہیں آرہا ہے آپ ہی کچھ لے آئیے گا اور یہ کہہ کر تین ہزار روپے اپنی ممی کو اُس نے دے دیے تھے۔ ثنا کی ممی کے بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ عید کے موقع پر اپنی بیٹی کو کیا دیں اس لیے انہوں نے ایک لفافہ میں تین ہزار روپے رکھ کر ثنا کے حوالے کر دیے تھے اور ثنا سے کہا تھا کہ بیٹا یہ تمہارے کچھ کام آئے گا۔ ثنا کو گھر کے حالات کا علم اچھی طرح سے تھا اس لیے اس نے لینے سے انکار کر دیا لیکن جب اس کے بھائی صوفیان نے اُس کو سمجھایا کہ آپا اب میں کمانے لگا ہوں اس لیے پہلی عید پر مجھ سے نہیں یہ ممی کی طرف سے ہے۔ اس کو قبول کرنا ہی پڑے گا بہت منانے کے بعد ثنا نے پیسے لے لیے تھے۔

اسی طرح دن گزرتے رہے اور صوفیان نے ایک کے بعد دوسرے وکیل اور اب تو باقاعدہ اُس نے گھر پر کمپیوٹر لگا لیا تھا اور زیادہ تر وکیلوں اور ججوں کا کام وہ گھر پر ہی کرتا تھا کیونکہ اُس کو جوڈیسری کا کام کرتے ہوئے کافی تجربہ ہو چکا تھا اس لیے زیادہ تر اُس سے ہی لوگ کام لیتے تھے۔ آمدنی اب بڑھ گئی تھی، پیسے بھی اب کافی جمع ہو چکے تھے، ایک دن ممی نے کہا کہ بیٹا اب شادی کے دن تمہارے آگئے ہیں کوئی لڑکی وغیرہ ڈھونڈھنے نکلوں؟ تب صوفیان نے کہا کہ پہلے ملکہ اور عالیہ کی شادی کے لیے رشتہ ڈھونڈھیے تب میرا اور اس طرح دونوں بہنوں کا رشتہ ڈھونڈھا جانے لگا اور یہیں لکھنؤ ہی میں دونوں بہنوں کا رشتہ طے ہوگیا، اور اپنی چھوٹی سی کمائی میں صوفیان نے کسی طرح ادھار قرض لے کر دونوں بہنوں کی متوسط گھرانے میں شادی کر دی۔

ادھر صوفیان کی شادی کے لیے کئی جگہ سے آفر آنے لگے، ثنا کے گھر بہرائچ سے بھی اچھے اچھے رشتے آنے لگے، لیکن صوفیان نے منع کر دیا کہا کہ میں اپنی بہن کو دیکھ رہا ہوں، کتنے دنوں بعد آتی ہے، اُس کے شوہر اتنے مصروف ہیں کہ ساتھ میں آتے بھی نہیں، کام کا نقصان بتاتے ہیں لہٰذا میں بھی کہیں لکھنؤ سے باہر شادی نہیں کروں گا اور لکھنؤ میں ہی کروں گا۔ ایک رشتہ بہرائچ کا تھا، لیکن لڑکی والے لکھنؤ ہی میں رہتے تھے، لڑکی لکھنؤ کے سرکاری اسکول میں ٹیچر تھی، ثنا کی ممی کی ایک سہیلی بہرائچ کی تھیں جو لکھنؤ ہی میں رہتی تھیں اُن کا نام بیگما بی بی تھا وہ بھی رشتے لگاتی تھیں، بدلے میں دو ہزار روپے لیتی تھیں، انہوں نے ایک دن آکر ثنا کی ممی کو اس رشتے کے بارے میں بتایا تھا اور کہا تھا کہ تم لوگ آکر مل لو میں لڑکی سے صوفیان کو ملوا دوں گی دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیں کیونکہ آج کل کا ماڈرن ماحول ہے لوگ ایک دوسرے کو سمجھ لیں گے تو رشتہ میں مضبوطی پیدا ہوگی، اس طرح بات آگے بڑھی اور ایک دن اچھی تاریخ دیکھ کر ملاقات کا وقت چار بجے شام کا مقرر کر دیا گیا۔ یہ لوگ شیش محل میں کرائے پر رہتے تھے، اور بیگما صاحبہ بھی شیش محل میں رہتی تھیں اس لیے انہوں نے اپنے گھر پر لڑکی کو اور لڑکی کے گھر والوں کو بلا لیا اور صوفیان کے والدین کو بھی بلا لیا، صوفیان بھی ساتھ میں تھے، ثنا کی ممی نے لڑکی کے والدین سے اور لڑکی سے ملاقات کی اور کہا کہ جاؤ صوفیان کو اندر بلا لاؤ لیکن لڑکی شرما کر اندر چلی گئی، اور صوفیان سے ملاقات کرنے سے منع کر دیا، صوفیان باہر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، لڑکی کا بھائی صوفیان کا انٹرویو لے رہا تھا، اور صوفیان اُس کا مناسب جواب دے رہا تھا، اتنے میں بیگما باجی آئیں اور لڑکی کے بھائی سے کہا جو کہ صوفیان سے انٹرویو لینے میں مصروف تھا کہ اپنی بہن کو صوفیان سے ملوا دو، وہ بھڑک اٹھا اور کہا کہ میں کیسے ملوا دوں یہ ہم لوگوں کے یہاں نہیں ہوتا ہے۔ بیگما باجی نے کہا کہ تم سے تو بات ہو چکی تھی اس سلسلہ میں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے ملوا دیا جائے اور تمہاری بہن تو نقاب بھی نہیں پہنتی، اسکول میں پڑھانے جاتی ہے بغیر نقاب کے تو یہاں ملوانے میں کیا ہے؟ لیکن لڑکی کا بھائی ٹس سے مس نہیں ہوا اور بیگما باجی کی بات خراب ہوگئی، جس سے کہ یہ لوگ صرف ناشتہ کر کے وہاں سے چلے آئے۔ گھر پر آکر صوفیان اپنی والدہ پر ناراض ہوا اور کہا کہ آپ لوگوں نے اپنا بھی ٹائم برباد کیا اور میرا بھی کیونکہ یہاں پر مجھے اچھا نہیں لگا اور کہیں دوسری جگہ دیکھیے۔ شام کو بیگما باجی اپنی چھوٹی بیٹی فاطمہ کے ساتھ گھر پر معذرت کرنے آئیں اور کہا کہ لڑکی کی فوٹو واپس کر دیجئے جس پر صوفیان کی والدہ نے فوٹو واپس کرتے ہوئے کہا کہ بیگما بی بی تم نے کیسے بات کی تھی پہلی ہی دفعہ میں بات خراب ہوگئی، اب کہیں اور کا رشتہ نہ بتانا لیکن صوفیان کو بیگما کی چھوٹی بیٹی فاطمہ جو اُن کے ساتھ آئی تھی، پسند آگئی اور اس نے الگ بلا کر اپنی ممی سے کہا کہ فاطمہ کے لیے رشتہ دیجئے نا۔ بیگما کی یہ چھوٹی بیٹی فاطمہ اُن کے ساتھ چلتی تھی جب بھی وہ کہیں جاتی تھیں فاطمہ کو لے جاتی تھیں، انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا اس کی شادی کے بارے میں کیونکہ اُن کی بڑی بیٹی ابھی کسا باقی تھی شادی کے

لیے، اُس کا رشتہ ایک جگہ سے چل رہا تھا بات چیت بھی طے ہوگئی تھی لیکن عین موقع پر لڑکے والوں نے کار کی فرمائش کر دی تھی، جس کو یہ لوگ کہاں سے پورا کرتے اس لیے وہ کینسل ہوگیا تھا، اور یہ چھوٹی بیٹی فاطمہ ان کے ساتھ چلتی تھی، کھل کر بات کرتی تھی، ہنسی مذاق بھی ہوتا تھا، پتہ نہیں کہاں سے اور کیوں صوفیان کو یہ لڑکی اچھی لگی اور اس نے اپنے دل کی بات اپنی ممی سے کہہ دی تھی۔ جس پر صوفیان کی والدہ نے بیگما کو فوٹو واپس کرتے ہوئے کہا کہ یہ لو اُن کی فوٹو وہاں تو منع کر دیجئے گا اور ہاں آپ کو اپنی بیٹی سے رشتہ یہاں کرنا ہو تو بتا دیجئے گا، گھر پر جا کر سوچ لیجیے گا تب بتا دیجئے گا کیونکہ ہم لوگ ایک دوسرے کو جانتے و سمجھتے بھی ہیں اور صوفیان نے خود دیکھا ہے کہ آپ کی فاطمہ بڑی ہنس مکھ لڑکی ہے اس لیے اُسے پسند بھی آگئی ہے۔

بیگما باجی کے دل میں تو لڈو پھوٹ رہے تھے کیونکہ لڑکا بھی اچھا تھا، خاندان بھی اچھا تھا، لڑکے کو وہ بہت دنوں سے جانتی تھیں، وہ جلدی جلدی اٹھیں اور وہاں سے رخصت لی، راستے میں انہوں نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ بتاؤ لوگ کہتے ہیں کہ پڑھنے آئے تھے نماز اور گلے پڑ گئے روزے لیکن یہاں تو الٹا ہوگیا آئے تھے آگ لینے اور مل گئی پیغمبری۔ فاطمہ نے پوچھا ممی آپ کیا کہہ رہی ہیں میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تب ان کی ممی نے بتایا کہ صوفیان نے تمہارا ہاتھ مانگا ہے، اگر تم راضی ہو تو بتاؤ یہ سن کر فاطمہ نے کہا کہ ممی ابھی تو میں نے شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں ہے اور کسا باجی کا رشتہ ابھی طے ہوا تھا وہاں سے منع ہوگیا ہے اسی غم میں ہم لوگ لگے ہوئے ہیں اور آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ جس پر بیگما نے کہا کہ کیا ہوا سامان کسا کا سارا موجود ہی ہے، نہیں بڑی بہن چھوٹی بہن ہی سہی، سامان بھی خراب نہیں ہوگا تمہاری بڑی بہن کی شادی بعد میں ہو جائے گی، گھر پہونچ کر بات ہوئی، بڑے بھائی بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ صوفیان کو اچھی طرح سے جانتے تھے، فاطمہ کے پاپا بہرائچ میں رہتے تھے، اُن کو بھی یہ خبر دی گئی کہ ایسی ایسی بات ہے کسا کی شادی بعد میں ہو جائے گی، وہ بھی بہرحال راضی ہوگئے اور رشتہ کی تاریخ طے ہوگئی۔ الغرض جلد بازی میں شادی ہوئی اور وہ بھی پندرہ دن کے اندر۔

گھومنے کے لیے صوفیان فاطمہ کے ساتھ بمبئی نکل گئے اور پندرہ دن کے بعد لوٹے گھر میں خوب رونق تھی لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ جہاں پر صوفیان کی چھوٹی بہن عالیہ کی شادی ہوئی تھی وہاں سے وہ جھگڑا کر کے آگئی تھی، گھر کا ایک الگ ماحول ہوگیا تھا، عالیہ کی گود میں ایک چھوٹی سی بچی بھی تھی جس کو وہ ساتھ لے کر آئی تھی، چونکہ عالیہ اور ملکہ دونوں کی شادیاں صوفیان نے لوکل ہی کی تھی اس لیے یہ لوگ آئے دن آتے تھے اور صوفیان سارا بار سہتے تھے، لیکن اب چونکہ شادی ہو چکی تھی، اس لیے فاطمہ کو بہت برا لگتا تھا۔ فاطمہ سوچتی تھی کہ یہ لوگ نہ آیا کریں جس کا اظہار اُس نے دبی زبان میں یوں کیا کہ "تم لوگ خوشی خوشی آیا کرو، تو ہم لوگوں کو بھی اچھا لگے، لڑائی جھگڑا کر کے نہ آیا کرو، یہ اچھا نہیں ہوتا ہے۔" آگے فاطمہ یوں کہتی تھی کہ اب میری شادی یہاں ہوگئی ہے میں تو اب مر کر یہاں سے نکلوں گی چاہے جتنا شوہر مجھے مارے پیٹے، جھگڑا کرے سب کچھ سہوں گی، پر یہیں رہونگی، جس کو سن کر سب سمجھ تو جاتے تھے لیکن فاطمہ سے کچھ کہہ نہیں پاتے تھے۔ اور ایک دن جب عالیہ کے شوہر آئے تو فاطمہ نے اُن کو بلا کر بات کی اور نہ جانے کس طرح سے بات کی کہ دونوں میں میل کرا دیا جس کی تعریف عالیہ کی ماں نے بھی کی اور عالیہ کو اُس کے گھر یہ تاکید کرتے ہوئے کہ اب کبھی وہ لوگ لڑائی جھگڑا نہیں کریں گے، خوشی خوشی بھیج دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صوفیان اپنی بیوی سے بہت خوش ہوئے اور کہا کہ واقعی تم نے میری قسمت کے ساتھ ساتھ میرے گھر کی بھی قسمت بدل دی۔

وقت کب رکتا ہے، گزرتا رہا اور وہ دن بھی آیا کہ صوفیان صاحب اولاد بنے اور ایک خوبصورت سا چاند جیسا بیٹا ان کے یہاں پیدا ہوا، لیکن اسی درمیان میں صوفیان کے والد کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی اور ان کا نہ جانے کیوں بڑی جلدی انتقال ہوگیا، جس کا غم صوفیان کو بہت پہونچا، اور اس کا بزنس پر بہت اثر پڑا، کام کم ہوگیا کیونکہ صوفیان ٹائم نہیں دے پا رہے تھے، اس لیے آمدنی میں گراوٹ آنے لگی لیکن فاطمہ واقعی بڑی صبر دار لڑکی تھی، لبوں پر ایک لفظ بھی نہ لاتی تھی، صوفیان کو سمجھانے کے طور پر فاطمہ کہتی تھی کہ اب ہم لوگوں کو اللہ نے ایک اولاد دی ہے لہٰذا دماغ سے کام لیجیے اور غور کیجئے کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے اس ٹاپک پر بیٹھ کر بات کیجئے۔ ایک دن رات میں کافی دیر تک اس ٹاپک پر بات چیت ہوتی رہی کہ کس طرح سے آمدنی کے ذرائع میں اضافہ ہو، بچہ ابھی بڑا ہوگا اسکول جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ اور اس مسئلہ کا تصفیہ فاطمہ نے یہ بتایا کہ پاپا والی دوکان کا کرایہ کم آتا ہے اُس کو خالی کرائیے اور اپنا کمپیوٹر گھر سے ہٹا کر وہاں لگا دیجیے جس سے کہ مارکیٹ کا کام بھی آئے گا اور آمدنی میں اضافہ بھی ہوگا کیونکہ گھر پر آپ کے جاننے والے ہی آتے ہیں اور دوکان ہوگی تو وہاں سبھی لوگ آسانی سے آئیں گے، لہٰذا صوفیان نے یہی کام کیا، دوکان خالی کرا کر وہاں پر کمپیوٹر کی دوکان کھولی، بڑا ایڈ چاروں طرف کیا گیا، ایک فوٹو کاپی مشین لگوائی گئی، وہاٹسپ سے شروع میں دو روپے پرنٹ آوٹ، اور فوٹو کاپی صرف ایک روپے میں رکھی گئی، جس سے کہ بزنس اچھا چل نکلا کچھ دن تو تھوڑی سی پریشانی ہوئی، لیکن دو تین مہینے بعد دوکان چل نکلی اور صوفیان کی آمدنی پھر سے اچھی ہونے لگی جس سے کہ اُس کے حالات اب پہلے سے بہتر ہوگئے۔

اب صوفیان نے اپنی دوکان پر ایک لڑکے کو ۱۰ ہزار روپے مہینہ پر رکھ لیا جو فوٹو کاپی بھی کرتا تھا اور کمپیوٹر کا کام بھی بہ آسانی کرتا تھا، ادھر صوفیان نے بینک میں امتحان دیا تھا جس میں وہ پاس ہوگیا اور سرکاری بینک میں اُسے جاب مل گئی، جس سے اُس کی آمدنی میں اضافہ ہوگیا اور دن اچھے گزرنے لگے، صوفیان نے اپنے بیٹے کو حضرت گنج کے پلے ہاؤس میں ایڈمیشن کرا دیا لیکن دن اچھے ہونے کے ساتھ ہی صوفیان کی والدہ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی، اور وہ ہفتہ دس دن کے اندر ہی اس دنیا سے کوچ کر گئیں جس کی وجہ سے گھر میں بڑی اداسی چھا گئی۔ اس افسوسناک موقع پر صوفیان کی ساری بہنیں اپنے بچوں کے ساتھ گھر پر ہی موجود رہتی تھیں لیکن صوفیان کو نوکری مل جانے کی وجہ سے بالکل پریشانی نہ ہوتی تھی، اور فاطمہ بھی ان لوگوں کا اپنی بہنوں کی طرح خیال رکھتی تھی، صرف یہ کہتی تھی کہ آپ لوگ جب تک دل چاہے رہیے لیکن میرا بیٹا چھوٹا ہے اس لیے آپ ہی لوگ جو دل چاہے پکائیے اور کھائیے، میں نہیں پکا پاؤں گی، لہٰذا صوفیان کی بہنیں کھانا بھی پکا لیتی تھیں اور دسترخوان بھی لگا دیتی تھیں جس سے فاطمہ پر بھی کوئی بار نہیں پڑتا تھا اور وہ خوش بھی بہت رہتی تھی، فاطمہ کی تدبیر سے اور قسمت سے صوفیان کی زندگی تو اچھی بن گئی تھی واقعی ہو تو ایسی لڑکی جیسے کہ فاطمہ۔

□□□

التماس

"ماہنامہ نیادور" کو ارسال کیے جانے والے مضامین اور تخلیقات کا معیاری ہونا ضروری ہے اور مسودات کمپوز شدہ، مکمل ایڈریس، موبائل نمبر اور تصویر کے ساتھ ہونا لازمی ہے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اشاعت ممکن نہیں ہوگی۔

ادارہ--

ترنم زیدی

448/884،نیپیئر روڈ، پارٹ سکنڈ لکھنؤ

7991938062

افسانہ

احساس

ویسے تو میں بچپن سے ہی چنچل تھی لیکن چنچل ہونے کے ساتھ ہی ساتھ پتہ نہیں کیوں میرے مزاج میں غصہ اور روکھا پن تھا، اُس کی وجہ تھی محلہ کی سوسائٹی، کیونکہ جہاں میں رہتی تھی وہاں کے لوگ زیادہ تر اَن پڑھ، گنوار قسم کے لوگ تھے، بات بات میں جھگڑا کرنے لگتے تھے، لہٰذا میں بھی کب تک اِس کے زیر اثر نہ آتی اس لیے میرا بھی مزاج وہاں کے مطابق ڈھل چکا تھا، اگر کوئی میرے بھائیوں کو بے وجہ گالیاں دیتا یا مارتا تھا تو میں بھی اُسکے جواب میں کم نہ تھی اس لیے میرا بھی مزاج لڑاکو جیسا ہو چکا تھا، میری ممی مجھے برابر سمجھاتی رہتی تھیں کہ بیٹا تمہیں سسرال جانا ہے، اگر ایسا کروگی تو اُلٹے پاؤں تمہاری ڈولی واپس آجائے گی، مگر میں کہاں ماننے والی تھی، سماج کا اور سماج کے رہن سہن کا اثر وہاں کے عوام پر ضرور پڑتا ہے اس لیے میں اس سے مبرا کیسے رہ سکتی تھی۔ بہرحال اسی طرح دن گزرتے رہے اور اسی اثناء میں میں نے کسی طرح گریجوئٹ کرلیا، میرے کالج کی فرینڈز آتی تھیں انہوں نے بھی میرے محلہ کا ماحول دیکھتے ہوئے آنا اب ترک کر دیا تھا جس سے میں اب اکیلی ہو چکی تھی، بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھی لیکن میری ابھی باقی تھی۔ میری ممی میرے ایجوکیشن کے مطابق رشتہ ڈھونڈھ رہی تھیں لیکن جس محلہ میں ہم لوگ رہتے تھے وہاں تو درد وزی، مزدور پیشہ افراد رہتے تھے تو میرے لائق رشتہ کہاں ملتا۔ بہت کوشش کرنے کے بعد ایک رشتہ ملا تو لڑکا ڈرائیور تھا لیکن اُس کے گھر کی بیک گراؤنڈ اچھی تھی، لڑکے کے بڑے بھائی سرکاری دفتر میں افسر تھے، اور اُن کے بڑے بھائی نے بڑی کوشش کی کہ یہ چھوٹا بھائی تعلیم حاصل کرلے لیکن محلہ کی سوسائٹی کا اثر اُس پر بھی پڑا اور اس نے تعلیم نہیں حاصل کی کسی طرح بڑے بھائی کی کوششوں سے وہ صرف جونیر ہائی اسکول تک ہی پڑھ سکا لیکن اُن کے گھر کا ماحول بہت اچھا تھا، اُن کے گھر سے کوئی محلہ میں نہیں نکلتا تھا، بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی اور چھوٹے بھائی کی شادی ابھی باقی تھی۔ لہٰذا میری ممی نے مجھے سمجھانا شروع کیا کہ دلاور کی ممی نے تمہاری شادی کا رشتہ بھیجا ہے، اگر تم کہو تو بات آگے بڑھائیں، لیکن وہی مسئلہ تھا کہ میں گریجویٹ تھی اور حنیف صرف جونیر ہائی اسکول، کیسے گاڑی چلے گی؟

میری زندگی کا سوال تھا، میری ممی مجھے بار بار سمجھاتی رہتی تھیں کہ بیٹا اپنے مزاج کو نارمل بناؤ یہ تم منھ بنائے رہتی ہو اس کی وجہ سے تمہارے منھ کی رونق چلی جارہی ہے، اور تمہارا منھ بالکل ہر چیز سے عاری نظر آتا ہے، تمہارے منھ کی رونق چلی جارہی ہے، روکھا پن زیادہ رہتا ہے، کیونکہ تم ہر کسی سے روکھے پن سے بات کرتی ہو تو مزاج تو روکھا ہو رہا ہے ساتھ ہی چہرہ پر تمہارے غصہ کی وجہ سے جب تم کسی سے بات کرتی ہو تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم اُس سے نفرت کرتی ہو وغیرہ وغیرہ سمجھاتی رہتی تھیں لیکن یہاں کہاں اثر پڑنے والا، چہرہ تو میرا ایسا ہو چکا تھا، گوری چمڑی تھی اس لیے مجھے نہیں محسوس ہوتا تھا کہ میں ایسی ہوئی جارہی ہوں جیسا کہ میری ممی مجھ کو برابر سمجھاتی رہتی ہیں لیکن احساس ضرور ہوتا تھا کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہے تبھی تو میری ممی برابر مجھے ٹوکا کرتی ہیں۔ ایک اور پریشانی تھی جو اندر ہی اندر مجھے کھائے جارہی تھی اور وہ یہ کہ میرے محلہ میں جہاں میں رہتی تھی، زیادہ تر شادیاں کامیاب نہیں ہوتی تھیں اِدھر شادی ہوئی اور اُدھر کچھ دنوں بعد خبر آئی کہ طلاق ہوگئی، اس لیے مجھے بھی ایک ڈر ستاتا رہتا تھا کہ اگر خدانخواستہ میرے ساتھ بھی یہ ہوگیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی، لیکن میری ممی کے بہت سمجھانے پر میں حنیف کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند ہوگئی۔ حنیف سے قبل میرے رشتے بہت آئے لیکن وہ سارے لوگ آری دردوزی یا پرچون کی دوکان والے ہی آتے تھے، چونکہ میرے پاپا بھی اسکول کی بس چلاتے تھے اس لیے ایسے ہی تو رشتے آئیں گے کسی کو کیا پتہ کہ اُن کی بیٹی گریجوئیٹ ہے، رشتہ تو گھر کی بیک گراؤنڈ دیکھ کر آتے ہیں۔ اس میں لوگوں کی کوئی خطا نہ تھی۔ ہاں ایک بات یہ ضرور تھی کہ میں اپنے کالج میں، اپنی سہیلیوں سے ضرور شیئر کرتی تھی کہ میرا محلہ جہاں میں رہتی ہوں وہاں یہ کیا بات ہے کہ

”انتظار کرتے کرتے ایک مہینہ گزر گیا اور کچھ سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے، ایسے میں حنیف پر بھی زور نہیں دیا جاسکتا تھا کیونکہ اُس کی ممی ہاسپٹلائزڈ تھیں اور ہم لوگ شادی کی بات کیسے کرسکتے تھے؟ اور تقریباً دو مہینہ گزرنے کے بعد آخرکار حنیف کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ میری والدہ بہت فکرمند رہتی تھیں کہ کسی طرح بیٹی کی شادی ہوجائے، ہر ماں کو فکر رہتی ہے لہٰذا اُن کو بھی میری فکر تھی اور رشتہ بھی بہت اچھا تھا لہٰذا اب ہم لوگ سوچنے لگے کہ اگر شادی میں اور تاخیر ہوگی تو کیا ہوگا، کیونکہ حنیف کے گھر کا یہ معاملہ تھا کہ اگر والدہ کا انتقال ہوگیا ہے تو ایک سال تک وہ کسی خوشی میں شریک نہیں ہوتے، لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا، اور خبر آئی کہ حنیف کی والدہ نے حنیف کے بڑے بھائی یعنی دلاور کو میڈیکل کالج میں بلا کر دلاور کے ہاتھ میں حنیف کا ہاتھ دے کر کہا تھا کہ اب میں نہیں بچوں گی۔“

لڑکیاں تو تعلیم حاصل کرتی ہیں لیکن لڑکے نہیں، اس سے کہیں سماج میں اتھل پتھل نہ پیدا ہو جس پر میری ایک فرینڈ نے کہا کہ پروین تم نے بالکل صحیح بات کہی یہ تمہارا ہی رونا نہیں ہے میں تو جس محلہ میں رہتی ہوں وہاں تقریباً دس بارہ ہزار کی آبادی ہے لیکن وہی دردوزی اور مزدوری کا کام ہوتا ہے لہٰذا لڑکے تو مزدوری کرتے ہیں اور اپنی بہنوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکول بھیجتے ہیں، اب تم خود سوچو کہ ہم لوگ پڑھ لکھ کر اگر ان لوگوں کے ہتھے چڑھیں گے تو اپنی کی زندگی کا قیمہ ہی تو بنے گا۔ اسی طرح قسم قسم کی باتیں ہوا کرتی تھیں اور اس سے مجھ میں خوف اور پیدا ہوتا جاتا تھا جس سے کہ میں شادی کے لیے رضامند نہ ہو رہی تھی۔ الغرض وہ دن بھی آ گیا کہ میرا گریجویشن کمپلیٹ ہو گیا اور میرے والدین نے مجھے اب آگے پڑھنے کے لیے منع کر دیا اور کہا کہ اب تمہاری شادی کی عمر ہو گئی، کب تک بغیر شادی کے رہو گی، ایک دن تو ہونا ہی ہے۔ اس طرح بہت تیزی سے رشتہ میرے لیے ڈھونڈھا جانے لگا لیکن مناسب رشتہ حنیف ہی والا پسند آیا اور میرے والدین نے حنیف کے گھر والوں کو بلایا، اور میرے رشتہ کی بات آگے بڑھا دی۔

اِدھر حنیف سے میرا رشتہ طے ہوا اور اُدھر میرے پاپا کی اچانک سے طبیعت خراب ہو گئی، کڈنی کے مریض تھے بستر پر لگ گئے اور اپنی دلی خواہش اُنہوں نے ظاہر کی کہ میری زندگی میں اگر میری بیٹی کی بھی شادی ہو جاتی تو کتنا اچھا ہوتا؟ لیکن اُن کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی اور اُن کا انتقال ہو گیا، میرے اوپر تو مانو غموں کا پہاڑ ٹوٹ گیا اور میں بالکل بے سہارا ہو گئی تھی، میرے سبھی بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھی لہٰذا اب میرا بھی گھمنڈ ٹوٹا اور جس طرح میں لوگوں سے بات کرتی تھی اُس میں بدلاؤ بھی آ گیا، نرم مزاج بننے کی بھی میں نے بہت کوشش کی لیکن یہ محلے والے کہاں لوگوں کو پسند کرتے ہیں کسی نے کہا کہ پتہ نہیں کیسے لوگ ہیں جیسے ہی بیچاری کا رشتہ حنیف سے طے ہوا پروین کے باپ چل بسے۔ داماد صحیح نہیں ہے اسی طرح لوگ آتے اور دھیرے سے میری والدہ کے کان بھر دیتے اور کب تک میری والدہ اس بات کو برداشت کرتیں لہٰذا میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ پروین تمہارے والد کے چالیسویں کے بعد بات آگے بڑھائیں یا ختم کریں کچھ تو ہونا چاہیے چونکہ میرے بھائی بھی ڈرائیوری کرتے تھے اور حنیف بھی کسی اسکول کی بس چلاتے تھے لہٰذا میرے بھائیوں کے ساتھ حنیف کا اٹھنا بیٹھنا بھی تھا اور اب تو وہ میرے گھر پر بھی آنے جانے لگے تھے۔ چونکہ رشتہ خود حنیف نے بھیجا تھا، اس کے علاوہ وہ مجھے بیحد پسند کرتے تھے اس لیے اپنی والدہ کو اور اپنی بڑی بہن کو رشتہ کرنے کے لیے بھیجا تھا اور رسمی طور پر امام ضامن ہو چکی تھی۔ امام ضامن والد کے انتقال سے قبل ہوئی تھی لہٰذا اب ہم لوگ رشتہ توڑ بھی نہیں سکتے تھے کہا جاتا ہے جو رشتہ توڑے گا وہ گنہگار ہو گا اسی لیے امام ضامن کی رسم کی جاتی ہے اس سے دونوں پارٹیوں کو رسمی طور پر باندھ دیا جاتا ہے، اسی درمیان میں میرے اچھے اچھے رشتے آنے لگے جس پر میں بڑی حیرت زدہ رہ گئی، میری ممی نے مجھے سمجھایا کہ یہ سب بیٹا قسمت کا کھیل ہے اگر یہاں ہم لوگوں نے زبان نہ دی ہوتی تب کہیں اور بات کرتے لیکن اب مجبوری ہے تمہاری شادی تو یہیں ہو گی۔

میرے والد کا چالیسواں ہو گیا اور اب میری شادی کی تیاریاں بڑی زور و شور سے ہونے لگی، لیکن اسی درمیان ایک دن ایک بری خبر سے دو چار ہونا پڑا وہ یہ کہ حنیف کی والدہ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے اور اُن کو میڈیکل کالج میں بھرتی کیا گیا ہے، اُن کے پیٹ میں پانی بھر گیا تھا جس سے کہ اُن کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی تھی اور کئی جگہ اُن کے بڑے بیٹے دلاور نے دکھایا لیکن کوئی آرام نہ ملا اور آخر کار اُن کو میڈیکل کالج میں وینٹی لیٹر پر رکھا گیا تھا، میرے گھر کے لوگ میڈیکل کالج بھی جاتے تھے اور حنیف کے گھر پر بھی جاتے تھے صرف اسی امید میں کہ حنیف کی والدہ جلد از جلد شفایاب ہوں جس سے کہ شادی کی رسمیں آگے پوری کی جا سکیں۔

اس طرح انتظار کرتے کرتے ایک مہینہ گزر گیا اور کچھ سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے، ایسے میں حنیف پر بھی زور نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ اُس کی ممی ہاسپٹلائزڈ تھیں اور ہم لوگ شادی کی بات کیسے کر سکتے تھے؟ اور تقریباً دو مہینہ گزرنے کے بعد آخر کار حنیف کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میری والدہ بہت فکر مند رہتی تھیں کہ کسی طرح بیٹی کی شادی ہو جائے، ہر ماں کو فکر رہتی ہے لہٰذا اُن کو بھی میری فکر تھی اور رشتہ بھی بہت اچھا تھا لہٰذا اب ہم لوگ سوچنے لگے کہ اگر شادی میں اور تاخیر ہو گی تو کیا ہو گا، کیونکہ حنیف کے گھر کا یہ معاملہ تھا کہ اگر والدہ کا انتقال ہو گیا ہے تو ایک سال تک وہ کسی خوشی میں شریک نہیں ہوتے۔ لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا۔ اور خبر آئی کہ حنیف کی والدہ نے حنیف کے بڑے بھائی یعنی دلاور کو میڈیکل کالج میں بلا کر دلاور کے ہاتھ میں حنیف کا ہاتھ دے کر کہا تھا کہ اب میں نہیں بچوں گی لہٰذا تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اب ان دونوں کی شادی کرانا یہ کہہ کر وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں، اڑتے اڑتے خبر ہم لوگوں کے یہاں بھی پہونچ گئی تھی کہ دلاور بڑے پڑھے لکھے تھے سرکاری ملازمت میں تھے اور چونکہ بڑے افسر تھے لہٰذا انہوں نے اپنی بڑی بہن سے کہا کہ آپا یہ میرے لیے میری والدہ کی وصیت ہو گئی حالانکہ مجھے خود پسند نہیں تھا یہاں کا رشتہ لیکن اب تو کرنا ہی پڑے گا، یہ میری ماں کی وصیت ہو گئی اگر وہ لوگ نہ کریں تو کوئی بات نہیں لیکن میں اب منع نہیں کر سکتا ہوں۔

الغرض حنیف کی والدہ کے چالیسویں کے بعد میری شادی حنیف سے ہو گئی۔ محلہ اور رشتہ داروں کے بہکاوے میں ہم لوگ نہیں آئے اور بیاہ کر میں حنیف کے گھر پہونچ گئی وہاں پر حنیف کے بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی ساتھ ہی میں رہتے تھے۔ بڑے بھائی دلاور صاحب کی بیوی صرف آٹھواں پاس تھیں اس کا بھی کوئی پروف نہیں تھا لیکن باتیں ایسی کرتی تھیں جیسے کوئی بہت بڑی آئی اے ایس افسر ہوں، اور دلاور صاحب تو کچھ بولتے ہی نہ تھے اُن کو اپنے آفس سے ہی فرصت نہ تھی کب آتے اور کب چلے جاتے کچھ پتہ ہی نہ چلتا، لے دے کر میرا ساتھ اپنی بھابھی سے رہتا، اُن کا نام محلہ والوں نے ہنکسنی بیگم رکھا تھا، اُن کو پانی بہانے کا بڑا شوق تھا ہر وقت پورا گھر گیلا کیے رہتی تھیں، کبھی واپَر لگایا کرتی تھیں، کبھی پانی کا پائپ لے کر پورے گھر کی دھلائی کیا کرتی تھیں اور ساتھ میں بڑبڑانے کی بھی عادت تھی کہ ہم لوگ صاف صفائی والے لوگ ہیں، گھر کو صاف رکھتے ہیں، گندے نہ ہیں نہ جانتے ہیں گندگی کو، مجھے محسوس ہوتا تھا کہ شاید یہ مجھ پر طنز کر رہی ہیں لہٰذا ایک دو بار مجھ سے بھی جھڑپ ہوئی جس پر میرے شوہر کو بہت برا لگا اور انہوں نے مجھے آگاہ کیا کہ میرے بڑے بھائی ہیں اُن کو کچھ نہ کہنا اور نہ اُن کی بیوی کو کیونکہ انہوں نے مجھے پڑھایا لکھایا ہے جس پر میں کہتی تھی کہ یہی پڑھایا ہے کہ ڈرائیوری کر رہے ہو اور وہ خود افسر بنے بیٹھے ہیں۔ اسی طرح کی نوک جھونک آئے دن روز ہوا کرتی تھی۔

چونکہ میرا مائکہ پاس میں تھا اسی لیے خیر خبر لینے کے بہانے میری والدہ بھی آ جاتی تھیں اور مجھے احساس دلاتی تھیں کہ بیٹا کسی بات کا برا مت مانا کرو یہی تو زندگی ہے یہ تمہارا سسرال ہے، یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کرنا پڑے گا نہیں تو زندگی آگے نہیں بڑھ پائے گی اور اب تو تمہارے والد بھی نہ رہے، لہٰذا میں اُن کی باتیں سن کر خود پر بڑا قابو رکھنے کی کوشش کرتی لیکن آخر کہاں تک رکھتی ایک دن میری اور بھابھی کی لڑائی ہو ہی گئی، انہوں نے بھی مجھے خوب سنائی تو میں نے بھی اُن کو نہیں چھوڑا اور سارا جو غصہ کافی دن سے میرے دل میں بھرا ہوا تھا نکال دیا، خوش تو میں بہت ہوئی لیکن شام کو جب حنیف آئے تو مجھے بہت برا بھلا کہا اور نوبت

یہاں تک آپہنچی کہ مجھے وہاں سے فوراً ہٹنا پڑا اور میں یہ کہہ کر اپنے مائکے آگئی کہ اب کبھی نہ آؤں گی۔ حنیف نے بھی کہہ دیا تھا کہ میں بھابھی کے اور بھائی جان کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہیں کروں گا۔ بہ مشکل میں ایک ہی دن اپنے مائکہ میں تھی کہ دیکھا سامنے میری بھابھی کھڑی ہیں اور مجھ سے کہا کہ تم یہاں ناراض ہو کر کیوں آئیں؟ میں بڑی حیرت زدہ تھی کہ جس کی وجہ سے مجھے ہٹنا پڑا وہ ہی مجھے لینے آیا تھا، بھابھی نے بڑے اپنے پن سے مجھ سے کہا چلو گھر، لڑائی جھگڑا اپنی جگہ مجھے دیکھو اب اس گھر میں آگئے ہیں مر کر ہی نکلیں گے تمہاری شادی کے ابھی چار دن بھی نہیں ہوئے کہ تم بھاگ آئیں، بہت برداشت کرنا پڑتا ہے سسرال میں کیا ذرا ذرا سی بات پر گھر چھوڑ دوگی؟ میری نظر میں اُس دن بھابھی کی عزت بہت بڑھ گئی، اور میں نے سوچا کہ میں گریجویٹ پاس ہوں اور یہ آٹھواں پاس یعنی کہ گھریلو زندگی میں ڈگریوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے تجربوں کی ضرورت ہے اور بھابھی نے تو میری زندگی ہی بدل دی، اور مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اور والدہ نے بھی اشارہ دیا کہ جاؤ وہ بڑی ہے گھر کی لینے آئی ہے لہٰذا میں بھابھی کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی، حالانکہ وہاں جا کر بہت کچھ سننا پڑا جیسے کہ نہ آتیں تو سڑ جاتیں کوئی لینے نہ جاتا وغیرہ وغیرہ، لیکن سب کچھ برداشت کر کے کسی طرح آگے کی زندگی گزارنے لگی۔

آہستہ آہستہ زندگی گزر رہی تھی لیکن پھر دھیرے دھیرے محلہ والوں نے ہم لوگوں کے کان بھرنا شروع کر دیے کہ حنیف کے بڑے بھائی بڑے مطلبی ہیں، اگر چاہتے تو اپنے دفتر میں حنیف کو نہ لگا دیتے لیکن آگے بڑھتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے، خود تو اتنے ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہیں اور تم لوگ اُن کے محتاج ہو، جو کچھ وہ چاہیں گے گھر میں پکے گا تم لوگ اُن کے رحم و کرم پر ہو، اپنے من کی کوئی چیز کھا بھی نہیں سکتے، بھابھی زیادہ تر دن میں مٹر پلاؤ بناتی تھیں اور اتنا ناپا تلا بناتی تھیں کہ اگر دوبارہ چاہو تو ملتا نہیں تھا اور شام کو اچھا کھانا پکتا تھا کیونکہ دلاور صاحب آفس سے آتے تھے اس لیے اُن کے لیے اچھا کھانا ہونا چاہیئے، دن میں کچھ بھی چل جاتا تھا، صبح کا جب میں ناشتہ بنا کر کچن سے نکلتی تھی تو بھابھی کہتی تھیں کہ پروین ذرا صاف صفائی کر دیا کرو، خوامخواہ چلایا کرتی تھیں اور اس لیے اُن کے لیے میرے دل و دماغ میں پھر سے نفرت جاگنے لگی اور پھر بات بات پر لڑائی ہونے لگی، کبھی پانی کو لے کر، کبھی کچن کی صفائی کو لے کر، اس لیے ایک دن حنیف کی بڑی بہن نے آ کر ہم لوگوں کا باورچی خانہ الگ کرا دیا، سکون تو مجھے بہت ملا لیکن پریشانی یہ ہونے لگی کہ اب بچت بالکل نہیں رہ گئی کیونکہ حنیف کی تنخواہ کم تھی، اور بھابھی کو بہت سکون ملا کیونکہ وہ بھی چاہتی تھیں کہ باورچی خانہ الگ ہو جائے، کیونکہ ہم لوگوں کی شادی نئی نئی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ہم لوگ اکثر گھومنے پھرنے کے لیے نکل جاتے تھے اور لوٹ کر گھر میں کھانا کھاتے تھے جو مجھے بھی اچھا نہیں لگتا تھا، اب بالکل ٹھیک تھا۔ اس میں سب سے زیادہ فائدہ حنیف کے والد کا ہوا تھا، اُن کو دونوں طرف سے کھانا پوچھا جانے لگا، حالانکہ کبھی اُن کے ساتھ بھی زیادتی ہو جاتی تھی، کہ ہم لوگ کہیں گھومنے گئے ہوئے تھے اور بھابھی بھی کہیں گئی ہوئی تھیں، انہوں نے سمجھا کہ پروین کھانا دیں گی اور میں سمجھی تھی کہ بھابھی کھانا دیں گی اسی چکر میں وہ اکثر بھوکے رہ جاتے تھے، ایک دن دلاور صاحب نے بھابھی کو بڑا ڈانٹ کیا اور کہا کہ تمہاری ذمہ داری ہے تم کو ہی میرے والد کو کھانا دینا ہوگا۔ اس طرح سے ہم لوگ کھانا دینے کے لیے بری الذمہ ہو گئے تھے، لیکن ایک دن اچانک حنیف کے والد کو برین ہیمرج کا دورہ پڑا اور وہ اسپتال میں داخل کیے گئے، کئی دن تک تو ہسپتال میں رہے، اُن کے ساتھ رات میں رکنے کے لیے دونوں بھائیوں نے نمبر لگا لیا ایک دن دلاور صاحب رکتے تھے اور ایک دن حنیف۔ کچھ دنوں بعد وہ گھر پر آگئے لیکن اُن کی یادداشت جا چکی تھی، اب وہ کسی کو نہیں پہچانتے تھے، بڑی مصیبت آگئی تھی ہم دونوں عورتوں پر یعنی مجھ پر اور بھابھی پر کیونکہ دونوں یعنی دلاور صاحب اور حنیف اپنے اپنے کام پر چلے جاتے تھے لے دے کر ہم لوگوں کو ہی اُن کی خدمت کرنا پڑتی تھی، بھابھی تیز طرار تھیں لہٰذا وہ پیمپر کسی طرح باندھ بھی لیتی تھیں اور کھول کر دھلا بھی لیتی تھیں، اور نہلانے کے لیے مجھے بلاتی تھیں، جس پر میں دل ہی دل میں بہت جھنجھلاتی تھی اور سوچتی تھی کہ کہاں آن پھنسی اپنے والد کا تو ہم لوگوں نے یہ سب نہیں کیا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ یہ بھی تو میرے والد کی طرح ہیں، کرتی تھی۔ حنیف بھی شام کو جب آتے تو اپنے والد کی خدمت کرتے اور پیر اُن کے نہیں اُٹھتے تھے اُس پر مالش وغیرہ کرتے، اور ایک دن وہ دھیرے دھیرے چلنے لگے لیکن اُن کا چلنا ہم لوگوں پر بھاری پڑ گیا کیونکہ جب سے وہ چلنے لگے تھے کہیں نہ کہیں نکل جاتے تھے، کبھی کانپور تو کبھی اٹاوہ۔ وہاں سے لوگوں کا فون آتا تھا کہ یہ آپ کے پاپا ہیں، حنیف کہتے کہ ہاں تو اُدھر سے جواب آتا تھا آ کر لے جائیے اتنے بزرگ آدمی ہیں اور آپ لوگ کیوں ان کو گھر سے باہر نکلنے دیتے ہیں کچھ ہو نہ جائے، بہر حال حنیف جا کر اُن کو لے آتے، ایک دن وہ گوالیر نکل گئے تھے، کسی نے اُن کو میڈیکل کالج میں بھرتی کرا کر دلاور صاحب کو فون کر دیا تھا کہ میں چچا میاں کا فون لیے لے رہا ہوں، اور میں نے ان کو گوالیر کے سرکاری اسپتال میں بھرتی کرا دیا ہے لہٰذا آپ لوگ آ کر لے جائیے۔ حنیف گئے تھے لینے اتنی دور کا سفر طے کرنا پڑا، بڑے بھائی کی کار سے جا کر لے آئے لیکن اس سب میں نوکری پر آنچ آگئی اور میرے شوہر کی اسکول کی نوکری چھوٹ گئی، بہت برے دن آگئے، اور ایک دن حنیف کے والد گئے تو آج تک نہ آئے کیونکہ پہلے اُن کے پاس موبائل رہتا تھا جو حنیف نے اُن کو فراہم کرایا تھا، اب کسی نے وہ موبائل لے لیا تھا گوالیر میں، دوسرا موبائل حنیف نے دیا تھا لیکن وہ لے نہیں گئے تھے یہیں گھر میں رکھا ہوا تھا۔ یہ تو کہیے کہ حنیف کو دردوزی کا کام بھی آتا تھا تو کسی طرح گھر کا خرچ چل جاتا تھا حنیف اتنے خود دار تھے کہ چاہے جتنی مصیبت آئے لیکن اپنے بھائی سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ یہ تو کہیے کہ بڑا اچھا ہوا ایک دن حنیف نے کہا کہ ڈیڈی اپنی زندگی میں میرا حصہ دے دیجئے، تو انہوں نے کہا کہ لے لو، اور حنیف نے کہا کہ اُٹھیے اور بتا دیجئے کہ کہاں سے کہاں تک کا حصہ مجھے آپ دے رہے ہیں انہوں نے ایک نشان لگا دیا کہ یہاں سے لے کر وہاں تک تم اپنا الگ بنوا لو چونکہ دلاور صاحب بھی وہاں پر موجود تھے، انہوں نے فوراً کہا کہ میرے والد نے اب تمہیں کہہ دیا ہے یہاں سے وہاں تک تم جب دل چاہے بنا لینا یہ بات میرے لیے وصیت کے برابر ہوگئی ہے۔ اب اس میں کوئی بدلاؤ نہیں ہوگا۔ میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا، کیونکہ میرے من کی بات ہوگئی تھی، اب ایک میں رہنے سے بھی پیچھا چھوٹ رہا تھا، میں نے فوراً اپنے بھائیوں سے کچھ روپیہ ادھار لا کر حنیف کو دیا اور کہا کہ فوراً تم کل یہاں سے لے کر وہاں تک کی دیوار اُٹھا لو کیا بھروسہ کل پھر نیت بدل جائے اور پھر ہم لوگوں کے ہتھے کچھ نہ لگے۔ اس طرح مکان کا بھی بٹوارہ ہو گیا تھا، اور میں بڑے آرام سے اپنی زندگی گزارنے لگی تھی۔

حنیف مجھ سے اور دلاور صاحب اپنی بیوی سے برابر کہتے کہ تم لوگوں نے اُن کو روکا کیوں نہیں آخر تم لوگوں کے رہتے ہوئے کیسے میرے والد چلے گئے، اب تو تم لوگوں کو سکون مل گیا ہوگا، کچھ کرنا نہیں پڑے گا، تم لوگوں کو ناشتہ اور کھانا دینا پڑتا تھا، نہلانا دھلانا پڑتا تھا اس لیے تم لوگوں نے ان کو روکا نہیں اور سوچا کہ جائے یہ بڈھا یہاں سے کسی طرح ہم لوگوں کو نجات ملے، جس پر ہم لوگ کہتے کہ کیسی باتیں آپ کرتے ہیں ہم لوگ بھی ان کو اپنے والد کی طرح سمجھتے تھے اب کہیں چلے گئے تو ہم لوگ کیا کریں۔ بہر حال دلاور صاحب نے اور حنیف نے ان کو ہر جگہ

ڈھونڈھا لیکن وہ نہ ملنے پر نہ ملے۔ اب تو اُن کو گئے ہوئے بھی تقریباً چھ سات سال ہو گئے، اور اُن کے لڑکوں نے اُن کا فاتحہ وغیرہ بھی کرا دیا۔ میں اپنے جیٹھ کو قابل سمجھتی تھی لیکن یہ بھی شک تھا کہ یہ بڑے گرو گھنٹال ہیں کھل کر میں حنیف سے کہتی تھی کہ سب کچھ آپ کے بڑے بھائی کا کیا ہوا ہے، بھابھی تو بڑبڑیا ہیں، منھ سے بھڑاس نکال لیتی ہیں۔ حالانکہ کبھی میں نے اُن کے منھ سے اپنی یا حنیف کی برائی نہیں سنی یہ تو صرف ایک شک تھا جو میرے دل میں گھر کر گیا تھا۔

ایک بار دلاور صاحب کو اپنی پھوپھی کے یہاں سے ایک لاکھ روپے کا چیک ملا، بتاتے چلیں کہ اُس میں سے انہوں نے صرف ۲۵ ہزار روپے حنیف کو دیے کہ مجھے یہ ملے ہیں، میں اپنی خوشی سے تمہیں دے رہا ہوں، تمہارا اس میں کچھ نہیں ہے لیکن بھائی کے ناطے میں تمہیں دے رہا ہوں۔ یہ سن کر مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے غصہ میں کئی جگہ کہہ دیا کہ میرے جیٹھ نے ساری پراپرٹی پر قبضہ کرلیا، کیونکہ پھوپھی نے دلاور صاحب کو پالا تھا اُن کے کوئی اولاد نہیں تھی لہٰذا اُن کو اپنے بیٹے کی طرح لکھایا پڑھایا تھا، اس لیے اُن کے نام سب کچھ کر دیا تھا، وہ امیر تھے اور امیر ہوتے جا رہے ہیں، ہم لوگ غریب ہیں تو ہم لوگوں کو بھیک کی طرح تھوڑے پیسے دے دیے۔ یہی سب دل کی بات زبان پر آ گئی۔ لوگوں نے دلاور صاحب سے نمک مرچ لگا کر بتایا کہ تمہاری بھاوج تمہیں ایسا بولتی ہیں، لیکن کیا مجال ہے کہ دلاور صاحب کچھ بولتے، خاموش رہتے اور کبھی کسی سے کچھ نہ کہتے، مجھے اب اور شک ہوتا اور میں حنیف سے لڑائی کرتی کہ آخر آپ بولتے کیوں نہیں ہیں کچھ، ایسے ہی آپ سیدھے بنے رہیں گے تو آپ کے بھائی آپ کو گھر سے نکال کر باہر کر دیں گے اور آپ سڑک پر آجائیں گے، لیکن حنیف میاں کچھ بولتے ہی نہیں تھے، یعنی کہ اپنے بھائی کی برائی سننا پسند نہیں کرتے تھے۔

ایک دن یہ بھی خبر آ گئی کہ حنیف کی پھوپھی کا بھی انتقال ہو گیا، جیٹھ گھر پر نہیں تھے دفتر کے کام سے آؤٹ آف سٹی تھے، لہٰذا تدفین کے سارے فرائض بھابھی نے سنبھالے یعنی پیسوں کا لین دین۔ اور دلاور صاحب جب آئے تو پتہ چلا کہ ساری دولت اُن کی پھوپھی نے دلاور صاحب کے نام کر دی۔ شہر میں ایک چھوٹا سا آٹھ سو اسکوائر فٹ کا دو منزلہ مکان بھی تھا جو کرائے پر پھوپھی اٹھاتی رہتی تھیں۔ اب وہ مکان دلاور صاحب کے ہتھے لگ گیا تھا، لیکن ایمانداری سے بلا کر انہوں نے اوپر کے دونوں کمرے حنیف کے حوالے کر دیا اور کہا کہ یہ ابھی پھوپھی کے نام مکان ہے، اس مکان کا فروخت ہونا مشکل ہے اور اگر فروخت ہوگا بھی تو کم پیسے ملیں گے لہٰذا اس مکان کو کرائے پر اٹھاؤ نیچے کا انہوں نے لے لیا اور اوپر والا حنیف کو دے دیا جس سے کہ میرے گھر کے حالات صحیح ہو گئے۔ حالانکہ بھابھی کو یہ بات بہت بری لگی تھی اور انہوں نے باتوں باتوں میں مجھ سے نہیں بلکہ دوسروں سے کہا تھا کہ نہ کوئی پھوپھی کی پروین نے خدمت کی نہ اُن سے ملنے جاتی تھی فری فنڈ میں دلاور صاحب نے حنیف کو پھوپھی کا مکان دے دیا۔ یہ سب باتیں مجھ تک پہنچ جاتی تھی لیکن دل کے کسی گوشہ میں میرے جیٹھ آج بھی بیحد پُر اسرار نظر آتے ہیں، میری شادی کے کم سے کم ۱۲ سال گزر گئے ہیں، میں اب دو بچوں کی ماں بھی بن چکی ہوں لیکن میرے جیٹھ کی پُراسراریت ویسے ہی برقرار ہے۔ وہ ویسے ہی اپنے دفتر سے آتے ہیں اور اپنے بچوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہیں، میں کسی بہانے جب وہ آتے ہیں تو بھابھی سے ملنے جاتی ہوں لیکن وہ مجھ سے بالکل نہیں بولتے، پتہ نہیں کیا بات ہے؟ آج تک مجھے نہیں معلوم کہ آخر ایسا کیوں؟ اور میں اس احساس میں اب تک مبتلا ہوں کہ یہ کیسی زندگی ہے؟ جس کا مجھے احساس نہیں۔

❑❑❑

غزل

ایسی جگہ بتا تو مجھے وہ جہاں نہ ہو
وحدانیت کا اس کی جہاں پر نشاں نہ ہو

یارب دعا یہی ہے مری تجھ سے صبح شام
محبوب میرا مجھ سے کبھی بدگماں نہ ہو

تیری یہ بات کیسے ستم گر میں مان لوں
ممکن نہیں مکان جلے اور دھواں نہ ہو

دنیا یہ روٹھ جا مجھے اس کا غم نہیں
لیکن خفا کبھی بھی مری مجھ سے ماں نہ ہو

معلوم ہے یہ تجھ کو غموں نے دیا ہے ساتھ
اے دل تو میرے اتنا ابھی شادماں نہ ہو

دارومدار جسم کا اس کے ہی دم سے ہے
دل مبتلا کشمکش امتحاں نہ ہو

انسان سرخ رو کبھی ہوتا نہیں ہنرؔ
جب تک کہ زندگی میں کوئی امتحاں نہ ہو

ہنرؔ رسولپوری

7718937729

عدنان

کاظمین روڈ لکھنؤ

9792361988

افسانہ

ایک لمحہ

ارے واہ آپ تو ذرا بھی نہیں بدلے، بلکہ پہلے سے اور زیادہ نکھر گئے ہیں۔ماشاءاللہ دوبئی کا پانی آپ کو سوٹ کر گیا۔فرحت نے مسکراتے ہوئے شان سے کہا۔جب سے وہ دوبئی سے آیا تھا تب سے وہ مسلسل اپنی شان میں خاندان والوں کے قصیدے سنتا آرہا تھا،وجہ اُس کو خود نہیں معلوم تھی کہ اس کی کیا ہے؟ بہرحال آج وہ اپنی پھوپھی کے گھر آیا تھا اور دوبئی سے جو سامان لایا تھا وہ دینے کے لیے۔ایک سنٹ کی شیشی اور ایک ڈبہ کھجور کا اس کے علاوہ زیتون کا تیل اور کافی چھوٹی چھوٹی چیزیں تھیں جو شان اپنے خاندان والوں کے لیے لایا تھا،یہی سلسلہ اُس کا چل رہا تھا سامان بانٹنے کا۔اتنی شیریں زبان میں فرحت نے شان سے کہا کہ وہ دنگ رہ گیا،آپ بیٹھیے میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں یہ کہتے ہوئے وہ کچن کی جانب چلی گئی اور شان کو اس کی پھوپھی نے گلے لگایا اور ساری خیریتیں پوچھی۔ باتوں کا سلسلہ چل رہا تھا کہ فرحت ایک ٹرے میں چائے اور دیگر لوازمات لے کر آگئی اور خود بھی بیٹھ گئی۔

چائے کا کپ شان نے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور نگاہیں اس کی فرحت کی نگاہوں میں تھیں ایسے کہ وہ فرحت کے دل کے اندر گھسی جارہی ہوں۔ہوں،اس نے ذرا جھینپ کر اپنا دوپٹہ صحیح کرتے ہوئے کہا۔آ...... آپ دوبئی سے کب آئے؟ شان نے سر پیچھے کو جھٹک کر ایک قہقہے کے ساتھ جواب دیا کہ جی بالکل اچھا خاصا ہٹا کٹا آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔اتنے سالوں سے آپ لوگوں سے ملاقات نہیں ہو پائی تھی لہٰذا آپ اپنی سنائیے کہ آپ لوگ کیسے ہیں؟ فرحت نے بڑے پیار سے جواب دیا کہ آپ کو دوبئی میں ہم لوگوں کی یاد کبھی نہیں آتی تھی اب یہاں آ کر باتیں بنا رہے ہیں۔حالانکہ شان خود سامان دینے کا بہانہ بنا کر فرحت کے یہاں آیا تھا کیونکہ اُس کے گھر والے فرحت کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے اور شان کے لیے لڑکی دوسری جگہ دیکھ رہے تھے۔

فرحت نے سر نیچے جھکا کر دھیمے سے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ ابھی رکیں گے کہ دوبئی پھر چلے جائیں گے۔اتنے پیار سے سنے ہوئے جملوں کو شان کو بہت اچھا لگا اور نہ جانے کیوں آج اس کے قرب کے احساس سے اس کا پورا وجود جھنجھنا اٹھا۔

میں...... میں تو ابھی تین مہینے انڈیا میں ہوں۔فرحت نے اور پھوپھی نے ساتھ میں کہا کہ آج تمہارا کھانا یہیں پر ہے بغیر کھانا کھائے آج تم یہاں سے ہل نہیں سکتے۔میں آپ کے لیے کھانا بناتی ہوں......کیا کھائیں گے آپ؟ فرحت نے شان سے پوچھا۔شان ابھی کچھ بول پاتا کہ اس سے قبل فرحت تیزی کے ساتھ مڑ کر کچن میں چلی گئی۔کھانا پکانے کے دوران اس کے ہاتھ دھیرے چل رہے تھے مگر دماغ تیز ترین رفتار سے بھاگ رہا تھا۔...... جیسے کتاب ماضی کے اوراق خود بخود ہوا کے جھونکوں سے پلٹتے جارہے ہوں......

فرحت اور شان دونوں ساتھ میں کھیلتے اور ساتھ میں ہی اسکول جاتے تھے ایک ہی کلاس میں تھے،اسی درمیان کب ان لوگوں نے گریجویٹ کمپلیٹ کرلیا اور پھر دونوں الگ الگ ہو گئے تھے کیونکہ شان ایم بی اے کر کے دوبئی چلا گیا تھا وہاں اُسے ایک اچھی جاب مل گئی تھی جبکہ فرحت ٹیچنگ لائن میں آگئی تھی اور ایک اچھے اسکول میں ٹیچر کی جاب مل گئی تھی۔وہ ابھی نہا کر اٹھی تھی کہ شان آگیا تھا اور اس نے جلدی جلدی اپنے گیلے بالوں کا جوڑا بنا لیا تھا لیکن آج اسے اپنے بال کچھ زیادہ ہی ریشمی اور نرم محسوس ہو رہے تھے جن کی سرسراہٹ اس کی گردن اور پشت پر عجیب سے ارتعاشات بیدار کر رہی تھی۔فرحت وہ دن یاد کر رہی تھی اور کچن میں کھانا بھی تیار کر رہی تھی کہ اچانک اُسے شان کے ساتھ گزارے ہوئے دن یاد آنے لگے۔وہ جب انڈیا میں تھا ایک دن گھر میں شان کو دیر ہوگئی تھی،پھوپھی نے اُسے روک لیا تھا،اور شان سے کہا تھا کہ گھر فون کردو کہ میں کل آؤں گا کیونکہ موسم بھی بہت خراب تھا لہٰذا شان نے اپنے گھر فون کردیا تھا اور اپنی ممی سے کہا کہ موسم بڑا خراب ہے لہٰذا میں آج پھوپھی کے یہاں رک جاتا ہوں اور کل صبح آجاؤں گا۔وہ جولائی کی ایک سیاہ اور گھٹاٹوپ رات تھی۔بے حد حبس اور گھٹن والی،شاید بارش ہونے والی تھی۔فرحت نے اپنی سلیپر ٹٹول کر پیروں میں ڈالی اور نائیٹ گاؤن

”فرحت کی تو جیسے جان نکل گئی تھی اور وہ حد درجہ خائف ہوگئی تھی اور عنقریب خوف سے چلا ہی پڑتی ،مگر حالات کی سنگینی کے احساس نے اس کے ہونٹ سی دیئے۔وہ بت بنی کھڑی رہ گئی تھی۔شان نے فرحت کو بڑے احتیاط سے اپنی کلائی میں پڑے کڑے سے الجھے اس کے بالوں کو آہستہ آہستہ الگ کیا...... ایک طویل سانس لی اور بغیر کچھ کہے باہر والے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بولٹ کرلیا ......وہ وہاں کتنی ہی دیر سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی رہی...... کچھ خوف کچھ بدحواسی اور کچھ عجیب وغریب قسم کے تاثرات لیے وہ پوری رات اپنے بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔اگلے ایک ہفتے تک تو نہ جانے وہ کیسے رہی لیکن کچھ دن بعد خبر ملی کہ شان دوبئی چلا گیا ہے لہٰذا سب کچھ حسب معمول چل رہا تھا اور نہ جانے کب یہ دو سال کا وقفہ گزر گیا اور پھر فرحت کے سامنے شان کھڑا تھا۔“

کسی شے سے بری طرح الجھ گئے۔ وہ بری طرح لڑکھڑائی، مگر کسی نے اسے سنبھال لیا، شانے اور کمر سے سنبھال کر کھڑا کر دیا۔ یہ کوئی نہیں تھا یہ شان تھا اوہ، یہ آپ ہیں فرحت۔

معذرت...... یہ میں ہوں...... شان معذرت...... میں میں...... مجھے گرمی لگ رہی تھی لائٹ آف ہوگئی تھی میں باہر...... آگیا...... مجھے نہیں پتہ تھا آپ...... اندھیرے میں دو ہاتھ اسے چھو رہے تھے...... اس نے جھرجھری لی...... رکیے، رکئے شاید آپ کے بال میرے کڑے میں پھنس گئے ہیں میں نکالتا ہوں انہیں، رک جائیے...... ڈریے گا نہیں، اور چلائیے گا بھی نہیں...... ورنہ سب جاگ جائیں گے اور پتہ نہیں میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ فرحت کی تو جیسے جان نکل گئی تھی اور وہ حد درجہ خائف ہوگئی تھی اور عنقریب خوف سے چلا ہی پڑتی، مگر حالات کی سنگینی کے احساس نے اس کے ہونٹ سی دیئے۔ وہ بت بنی کھڑی رہ گئی تھی۔ شان نے فرحت کو بڑے احتیاط سے اپنی کلائی میں پڑے کڑے سے الجھے اس کے بالوں کو آہستہ آہستہ الگ کیا...... ایک طویل سانس لی اور بغیر کچھ کہے باہر والے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بولٹ کرلیا...... وہ وہاں کتنی ہی دیر سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی رہی...... کچھ خوف کچھ بدحواسی اور کچھ عجیب و غریب قسم کے تاثرات لیے وہ پوری رات اپنے بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔

اگلے ایک ہفتے تک تو نہ جانے وہ کیسے رہی لیکن کچھ دن بعد خبر ملی کہ شان دوبئی چلا گیا ہے لہٰذا سب کچھ حسب معمول چل رہا تھا اور نہ جانے کب یہ دو سال کا وقفہ گزر گیا اور پھر فرحت کے سامنے شان کھڑا تھا۔ اچانک کوکر کی سیٹی نے اُس کو ڈرا دیا اور وہ کچن میں اُچھل پڑی اور سارے خیالات کے تسلسل ٹوٹ کر بکھر گئے۔ اچانک اُس نے دیکھا کہ شان کچن میں داخل ہوا اور کہا کہ فرحت میں کچھ تمہاری مدد کروں، کچن میں جگہ تنگ تھی، وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہوگئی...... نن ـ ـ ـ نہیں، ٹھیک ہے ٹھیک ہے، میں کرلوں گی، آپ پھوپھی جان کے پاس بیٹھئے میں کھانا بنا کر آرہی ہوں۔

فرحت...... اس نے جیسے اک آہ بھری۔ جی...... بے اختیار اس کی جانب نظریں اٹھ گئیں، فرحت، آپ کی شادی کہیں لگی؟ شان نے اُس سے اچانک سوال کیا؟ نہیں شان ابھی تو نہیں لگی، فرحت نے جواب دیا، یہ بات می سے کرو تو بہتر ہوگا یہ کہتے ہوئے وہ کچن سے باہر چلی گئی۔ شان تھوڑی دیر رکا اس کے بعد پھوپھی کے پاس آگیا۔ پھوپھی سے بھی اُس نے یہی سوال کیا کہ پھوپھی جان! فرحت کی شادی کہیں طے ہوئی کہ نہیں۔ ہاں ایک رشتہ فیض آباد سے آیا ہے لڑکا ایم بی اے ہے اور تمہاری ہی طرح وہ بھی دوبئی میں کسی کمپنی میں ملازم ہے۔ جب پھوپھی یہ شان کو بتا رہی تھیں اُدھر سے گزرتے ہوئے فرحت نے سن لیا۔ اور وہ یہ سن کر کانپ گئی، کیونکہ وہ پسند تو شان کو کرتی تھی لیکن اُس کے گھر والوں کو نہ جانے اِس گھر سے کیا دشمنی تھی کہ ذرا سا بھی لفٹ نہیں دیتے تھے اور اب تو حالات بھی اُن کے گھر کے اچھے ہو گئے تھے شان کی کمائی کی وجہ سے لہٰذا وہ اب ان لوگوں کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے تھے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے جب تک شان دوبئی نہیں گیا تھا اُس کے گھر کے حالات بہت خراب تھے یہ تو شان کی محنت اور لگن سے اُس کے گھر کے حالات بہتر ہو سکے تھے، فرحت کے ڈیڈی سرکاری ملازم تھے اور اُن کے حالات بہت اچھے تھے لیکن ذرا بھی گھمنڈ نہ تھا اور لوگوں کی مدد کرنا وہ اپنا فرض عین سمجھتے تھے، اب وہ رٹائر ہو چکے تھے لہٰذا اب اُن کے اتنے اچھے حالات نہ تھے۔

شان کی ماں ایک دن اپنے بیٹے سے یہی بات کر رہی تھیں کہ تم نے اتنی محنت کی آج ہم لوگوں کے حالات اچھے ہو گئے تو اب سبھی لوگ اپنی بیٹی دینا چاہتے ہیں پہلے سیدھے منھ بات نہیں کرتے تھے۔ شان نے کہا کہ نہیں ایسی بات نہیں ہے می کچھ آپ کو وہم ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے بات ٹال دی تھی۔ جب شان گھر واپس آیا تو اپنی می سے بتایا کہ فرحت کی شادی دوبئی میں لگ رہی ہے وہاں پر ایک لڑکا ہے جو کسی کمپنی میں ہے۔ پھوپھی جان بتا رہی تھیں۔ ارے تو بتا کہ تجھے کیا کرنا ہے؟ تیری شادی کی بات فرحت کے لیے کروں؟ اِدھر اُدھر کی بات مجھے بتا کر کنفیوز مت کرو۔ اتنا سننا تھا کہ شان نے اپنی ماں کو گلے لگا لیا اور کہا کہ می آپ کتنی پیاری ہیں! آپ نے تو میرا سارا مسئلہ ایک لمحہ میں ہی حل کر دیا۔ اور اچھلتا کودتا ہوا باہر چلا گیا۔

❑❑❑

غزل

کوئی مہوش وفا کا باب مجھ سے مانگے ہے
سراپا ہے غزل اسباب مجھ سے مانگے ہے

بڑھی ہیں دھڑکنیں دل کی جو تم کو دیکھا ہے
دل بیتاب حسیں خواب مجھ سے مانگے ہے

اجالوں کی مرے دل کو ہے جستجو ہمدم
اندھیرا گھر ہے یہ مہتاب مجھ سے مانگے ہے

بڑھائی خواب ہے ساقی نے پیاس رندوں کی
بجھانے تشنگی کو آب مجھ سے مانگے ہے

وہ میرے دل کو تو ٹکڑے کئے ہیں نظروں سے
ٹپکتے خون ہیں، اسباب مجھ سے مانگے ہے

بنا کے خوں سے کھنڈر کو عمارت رنگیں
کوئی مزدور ہے شب تاب مجھ سے مانگے ہے

سنا ہے جلوہ ہائے کوہِ طور کا قصہ
نظر مظہرؔ کی پھر بھی تاب مجھ سے مانگے ہے

مظہر زاہدی
پٹنہ
9934410620

ذکری حمید علیگ

چک بریہر بن، خان مارکیٹ، نزد مسجد، جھونسی، الہ آباد

8979959420

افسانچہ

استاد

شکر ہے، آج ہمارے فائنل سمسٹر کا رزلٹ آگیا اور معمول کے مطابق دوستوں کی کالس آنے لگیں سبھی نے مجھے خوش دلی کے ساتھ مبارک باد پیش کی کیونکہ ہر سمسٹر کی طرح میں نے اس بار بھی اپنی کلاس میں ہائی رینک (High Rank) حاصل کی تھی۔ میرے دوست مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم کس طرح اتنے اچھے نمبر حاصل کرتی ہو۔ تمہارے ممتاز ہونے کا راز کیا ہے۔ میں مسکراتی اور ان سب سے بس یہی بات کہتی تھی کہ میں محنت کرتی ہوں اور اللہ تعالیٰ سے اپنی محنت کے بدلے بہت بڑی کامیابی مانگتی ہوں اور ہاں! ایک اور بات یہ ہے کہ میں اپنے گرو (استاد) سے بہت کچھ سیکھتی ہوں بظاہر تو وہ میرے استاد ہیں لیکن ان کے ساتھ میری کوئی باضابطہ کلاس نہیں ہوتی لیکن جب بھی میں ان کے پاس بیٹھتی ہوں میں ان سے ضرور کوئی نئی بات سیکھتی ہوں جو میرے علم میں اضافہ کرتی ہے، وہ مجھ سے بھی زیادہ میری ترقی اور میری کامیابی کے لیے فکرمند رہتے ہیں اور میں ان کی اس فکر کو خوب سمجھتی ہوں اس لیے میں انہیں کبھی مایوس نہیں کرتی اور وہ میری رہنمائی کرتے رہتے ہیں وقتاً فوقتاً۔

آج میں پورے دو سال بعد گھر واپس آئی تھی ریسرچ کے درمیان یہ پہلی چھٹی تھی جو سپروائزر کی کافی منت وسماجت کے بعد ملی تھی۔ شام کی چائے کے ساتھ بھائی، بہنوں کی گپ شپ، فون کے شور نے اپنی جانب متوجہ کیا۔ دوسری طرف ثمرہ تھی آواز میں وہی شوخی تھی، وہ چہک رہی تھی۔ Dear میں تمہارے شہر (الہ آباد) میں ہوں۔ اچانک ملی خوشی پر میں محوِ حیرت تھی مگر دوسرے ہی پل حواس درست ہوئے۔ میں نے فوراً ہی اسے گھر آنے کی دعوت دی۔ ایڈریس بتا کر میں نے فون میز پر رکھا اور ایک نگاہ اپنے سراپے پر ڈالا۔ دل کو تسلی ہوئی میں ٹھیک ٹھاک لگ رہی تھی۔ ڈھلتے سورج کے ساتھ گاڑی کے تیز ہارن نے ثمرہ کے آنے کی یقین دہانی کرائی، میں نے خوشی سے اسے گلے لگایا، ساتھ ہی اس کے ننھے شدو کو گود میں لے کر پیار کیا۔ وہ ہوبہو اپنی ماں کی طرح جاذب نظر تھا۔ میں ثمرہ کو لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس نے کاوچ پر بیٹھنے کے ساتھ ساتھ مجھ سے میرے مصر کے سفر کے بارے میں پوچھا کہ کیسا رہا مصر کا سفر اور بتاؤ!! کب آئی ہو۔ الاظہر یونیورسٹی سے، میں نے اس کے جواب میں الحمدللہ کہا اور کہا بس چند روز قبل ہی آئی ہوں اور کچھ دنوں بعد ہی جانے کی تیاری بھی ہے۔ ساتھ ہی میں نے شبنم کو آواز دی۔ شبنم میرے اشارے کو سمجھ گئی تھی اور۔۔۔۔۔۔۔ پھر چند لمحے بعد ہی وہ ٹرے میں چائے وغیرہ کے ساتھ حاضر ہوئی۔ شبنم ہماری کافی پرانی اور ایماندار میڈ ہے۔ جو ہمارے گھر کے آنگن میں ہی کھیل کود کر پروان چڑھی ہے اور اب تو وہ ہم سب کی عادتوں سے خوب واقف ہے اور ہماری خدمت میں کوئی کمی نہیں کرتی اس کی اس ایمانداری کی وجہ بالکل صاف تھی وہ یہ کہ میرے والدین کا حسن سلوک۔

ناشتے سے فراغت کے بعد میں ثمرہ کو اپنے کمرے میں لے آئی۔ روم میں داخل ہوتے ہی وہ دیوار پر لگے میرے ایوارڈ کو دیکھنے لگی۔ اس نے حیرت سے کہا اتنے ایوارڈ ”ذکی“ کیسے۔ جواباً میں مسکرائی اور نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا ”صرف اپنے استاد کی وجہ سے“ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں میرے استاد کو دیکھنے کی شائق رہتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کچھ دیر آرام کرو میں ان سے بھی تم کو ملوا دوں گی۔ میں نے ثمرہ کو اپنے گھر کی خوبصورت لائبریری کا معائنہ بھی کرایا۔ شام کے وقت ہم اور ثمرہ گارڈن میں ٹہل رہے تھے اس نے مجھے صبح بات یاد دلائی میں نے کہا ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ آؤ میرے ساتھ میں ثمرہ کو لے کر ایک کمرے میں داخل ہوئی جو میری لائبریری سے بالکل ملا ہوا تھا۔ ہم نے استاد کو سلام کیا اور ان کے اشارے پر مؤدب بیٹھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ میں نے کہا ہاں! یہی میرے استاد ہیں۔ اس نے زیر لب کہا۔ تمہارے والد؟ میں نے ہاں میں گردن ہلادی اور چند لمحے بعد ہی ہم کھلے گارڈن میں واپس آگئے۔ میرے استاد نے ہمارے سر پر ہاتھ رکھا اور ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازا۔

میں نے محسوس کیا کہ ثمرہ اب بھی مطمئن نہیں تھی۔ میں نے کہا کیا بات ہے ڈیئر (Dear) اس نے کہا کچھ نہیں۔ بس یہی سوچ رہی ہوں کہ تمہارے والد، تمہارے استاد ہیں۔ میں نے کہا اصل بات یہ ہے کہ جب وہ مجھے پڑھاتے ہیں تو وہ صرف میرے استاد ہوتے ہیں والد کا کہیں شائبہ نہیں ہوتا ہے اور جب وہ والد ہوتے ہیں تو استاد کا کہیں رنگ نہیں ہوتا ہے۔ ان کے اس مخلصانہ رویہ نے میری شخصیت کو ایک پہچان دی ہے اور انہیں کی بدولت میں نے اپنے خواب ”الاظہر یونیورسٹی“ کو مکمل کیا ہے۔ خدا کرے سب کے والد ایسے ہی ہوں۔ ثمرہ نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا میں بھی آگے تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی تمہاری طرح۔ لیکن شادی اور شدو کی آمد نے میرے خوابوں پر کہیں نہ کہیں شب خون مارا ہے۔ سب کے حالات ایک جیسے نہیں ہوتے نا۔ ذکی۔ خیر! پھر اس نے شدو کو پیار کیا اور کہا کہ میرے لیے دنیا کی سب سند یہی ہے اور اس نے بھینچ کر شدو کو گلے لگایا۔ میں دیکھ رہی تھی شدو کو گلے لگاتے ہی وہ ساری دنیا سے بے نیاز۔ اس دنیا کی سب سے خوشحال عورت لگ رہی تھی۔

لیکن میں نے دیکھا اس کی آنکھیں نم تھیں اور حسرت سے میرے کمرے میں لگے ہوئے ایوارڈس کو دیکھ رہی تھی۔

❑❑❑

سید نازش احمد

اندرا نگر، لکھنؤ

9305365035

ترقیات

خواتین کا تحفظ حکومت کی اولین ترجیح

اتر پردیش کی یوگی آدتیہ ناتھ حکومت کی توجہ خواتین کے تحفظ کے ساتھ انہیں بااختیار بنانے پر رہتی ہے۔ وزیر اعلیٰ کے طور پر اپنے پہلے دور میں انہوں نے خواتین کی حفاظت کے نظام کو اولین ترجیح پر رکھا، جب کہ اپنے دوسرے دور میں وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ نے بیٹی کی حفاظت پر خصوصی توجہ دی۔ خواتین کا تحفظ حکومت کی اولین ترجیح ہے۔ سب کا ساتھ، سب کا وکاس کے عزم کے ساتھ، یوگی آدتیہ ناتھ کی اتر پردیش کی حکومت کی ٹیگ لائن ہے۔ بیٹیاں پڑھیں گی، تب ہی بیٹیاں بڑھیں گی اور بیٹیاں ملک کا فخر بنیں گی۔ یہ کام اسی وقت ممکن ہے جب بیٹیوں کی بہتر تعلیم، صحت اور حفاظت کا ایسا ماحول ہو جس میں وہ بغیر کسی خوف کے آگے بڑھ سکیں۔

ریاست کی یوگی آدتیہ ناتھ حکومت خواتین کو بااختیار بنانے پر توجہ دے رہی ہے۔ پہلے کی طرح ریاست کے قوانین نہ صرف بیٹیوں کو معاشی اور سماجی طور پر بااختیار بنا رہے ہیں بلکہ بیٹیوں کی حفاظت کے لیے ریاست میں ایسا ماحول پیدا کر رہے ہیں جس میں وہ ہر میدان میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کریں۔ اتر پردیش کی یوگی آدتیہ ناتھ حکومت کی توجہ خواتین کی حفاظت پر مبذول ہے۔ دوسری بار ملک کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش کی کمان سنبھالنے کے بعد یوگی حکومت بیٹیوں کو حفاظتی ڈھال فراہم کرنے کا کام کر رہی ہے۔ ریاست میں بیٹیوں کو تعلیم کے مواقع فراہم کرنے کے لیے وزیر اعلیٰ کنیا سمنگلا یوجنا شروع کی گئی، جس میں اب تک 13 لاکھ 44 ہزار بیٹیاں مستفید ہو چکی ہیں۔ غریب کنبوں کی بیٹیوں کی شادی کے لیے وزیر اعلیٰ اجتماعی شادی اسکیم شروع کی گئی، جس میں ایک لاکھ 91 ہزار سے زائد بیٹیوں کی شادیاں کی گئیں۔ اسی طرح چھوٹے بچے، خواتین اور نوعمر لڑکیوں میں غذائی قلت اور خون کی کمی کو کم کرنے کے لیے نیشنل نیوٹریشن مشن کے تحت انہیں مستفید کیا جا رہا ہے۔ خواتین کو جلد انصاف فراہم کرنے کے لیے ریاست میں 218 نئی فاسٹ ٹریک عدالتیں، 81 مجسٹریٹ سطح کی عدالتیں اور 81 ایڈیشنل سیشن کورٹ قائم کی گئی۔ بیٹی بچاؤ ۔ بیٹی پڑھاؤ اسکیم کے تحت ایک کروڑ 90 لاکھ بیٹیوں کو باخبر کیا گیا۔ شہری علاقوں میں خواتین کے لیے 4500 پنک بیت الخلاء بنائے گئے۔ بے سہارا خواتین کو پنشن دے کر سہارا دیا گیا۔ اس اسکیم کے تحت مستفید ہونے والی خواتین کے لیے عمر کی حد کی شرط ختم کر دی گئی۔ خواتین کی حفاظت کے لیے ہر ضلع میں اینٹی رومیو اسکواڈ تشکیل دی گئی۔ ریاست کے تمام اضلاع میں تشدد کا نشانہ بننے والی خواتین کے لیے ون اسپاٹ سینٹر قائم کیے گئے ہیں۔ اب تک 1 لاکھ 20 ہزار خواتین ایک اسپاٹ سینٹر سے مستفید ہو چکی ہیں۔ خواتین کی ہیلپ لائن 1090 سروس میں 98.80 فیصد شکایات موصول ہوئیں جن کا تصفیہ ہو گیا ہے۔

وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کی شہری علاقوں کے ساتھ ساتھ دور دراز دیہی علاقوں میں بیٹیوں اور خواتین کی حفاظت اور بیداری کے بارے میں سوچ کی وجہ سے ریاست بھر میں مشن شکتی کے تحت کئی پروگرام شروع کیے گئے۔ جس میں بیٹ سطح پر خواتین کانسٹیبل کو تعینات کیا جائے، تاکہ خواتین اور لڑکیوں کی حفاظت پر کڑی نظر رکھی جا سکے۔ تمام محکموں کے ملازمین کو چاہئے کہ وہ تال میل قائم کریں اور تمام مواضعات کی خواتین کے ساتھ خواتین بیٹ افسروں کے ساتھ بات چیت کریں اور انہیں اتر پردیش حکومت کی جانب سے خواتین کے لئے چلائی جا رہی فلاحی اسکیموں سے واقف کروائیں۔ اس کے ساتھ افسران کو چاہیے کہ وہ ہفتے میں ایک بار شہری وارڈوں اور مواضعات میں بڑے پیمانے پر مہم شروع کریں اور دیہی سکریٹریٹ میں خواتین سے متعلق مسائل کو مقررہ مدت میں حل کریں۔ بیٹیوں کی حفاظت کے لیے تمام اسکولوں اور کالجوں میں اینٹی رومیو اسکواڈ کو فعال کر دیا گیا ہے، شام کو پولیس کی ٹیم پیدل بازاروں اور پرہجوم علاقوں میں گشت بھی شامل ہے۔ تاکہ نہ صرف ریاست کا امن و امان بہتر رکھا جا سکے بلکہ خواتین کے خلاف جرائم کو بھی روکا جا سکے۔

سچ کہا جائے تو یوگی حکومت کی خواتین پر مبنی اسکیموں نے نہ صرف خواتین کو بااختیار بنایا ہے بلکہ انہیں تحفظ کے ساتھ طاقت، عزت اور فخر بھی حاصل ہوا ہے۔ آج عورتیں اور بیٹیاں کی خود مختاری یوپی کی پہچان بن رہی ہیں۔ وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ریاست کی خواتین اور بیٹیوں کی ترقی، احترام، سلامتی اور خود انحصاری کے لیے پرعزم ہیں۔ یوگی حکومت نے مشن شکتی جیسی زبردست مہم شروع کی۔ جس سے ریاست کی خواتین اور بیٹیوں کو تقویت ملی ہے۔ ایک طرف ریاستی حکومت دیہی اور شہری ماحول سے تعلق رکھنے والی خواتین اور بیٹیوں کو خود کفیل بنا رہی ہے تو دوسری طرف انہیں براہ راست مالی امداد بھی فراہم کر رہی ہے۔

❑❑❑

وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ اپنی قیام گاہ پر نیپالی وزراء سے رسمی ملاقات کرتے ہوئے۔

وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ بچیوں کے ساتھ ''بال امنگ'' پروگرام میں۔

वर्ष : **77** अंक 7
नवम्बर, 2022
मूल्य : 15 रु./—
वार्षिक मूल्य : 180 रु./—

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ — 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006—08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए शिशिर, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा प्रकाश एन. भार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलस, 3—सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक— **रेहान अब्बास**